ڈاکٹر سید عبداللہ

شعرائے اردو کے تذکرے
اور
تذکرہ نگاری کا فن

شعرائے اردو کے تذکرے

اور

تذکرہ نگاری کا فن

ڈاکٹر سید عبداللہ
ایم - اے - ڈی لٹ

قیمت ——————— چار روپے

ناشر ——————— مکتبہ شعر و ادب دہلی

مطبوعہ ——————— یونین پرنٹنگ پریس دہلی

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے خط کا اقتباس

مصنف کے نام

مشفقی و کرمی — تسلیم

آپ کا مضمون (مستقبلِ اردو کے متعلق)
پہنچا اور میں نے شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا
خوب لکھا ہے اور تحریر میں محاکمہ نہایت منصفانہ اور
معقول ہے۔

مجھے اس کے پڑھنے سے بصیرت حاصل ہوئی۔

مخلص
عبدالحق

مصنف کی دوسری تصانیف

دلی سے اقبال تک

رمزِ اقبال

سر سید اور ان کے نامور رفقا

مقاماتِ اقبال

میر امن سے عبدالحق تک

ترتیب

۳۔ تنقیدِ تذکرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فارسی تذکروں کا اثر

اردو تذکرہ نویسی اپنی ابتدائی منزلوں میں فارسی تذکرہ نویسی[1] کی نقل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو شعرا کے تذکرے مرتب ہونے شروع ہوئے تو ان میں نہ صرف عام اصول تصنیف کے لحاظ سے فارسی تذکروں کی تقلید کی گئی بلکہ ان تذکروں کی زبان بھی فارسی ہی رہی۔ چنانچہ اس فہرست میں جسے گارساں دتاسی نے مرتب کیا ہے کم و بیش ۱۱۳ تذکرے اور بیاضیں ہیں ان میں صرف ۶ تذکرے ایسے ہیں جو اردو میں لکھے گئے ہیں باقی سب کی

---

[1] کریم الدین نے طبقات الشعرا (۱۸۴۸ء) میں لکھا ہے: "تذکرے اور طبقات چونکہ شاخیں فن تاریخ کی ہیں۔ خصوصاً زبان عرب اور فارسی میں اس قسم کی بہت سی تصنیف ہوئی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی زبان اردو میں بھی اس طریق تصنیف کا استعمال کیا گیا ہے مگر یہ شوق تذکرہ نویسی کا ان ایام میں بیرامون خاطر لوگوں کا ہوا جب بنیاد اردو کی کامل ہونی شروع ہوئی" (دیباچہ صفحہ ۱)

زبان فارسی ہے۔ مصحفی (المتوفی ۱۲۴۰ھ) کے زمانے میں فارسی اور اردو کے مابین تفوق اور غلبہ کے لئے ایک دوڑ شروع ہو چکی تھی جس میں آگے چل کر فارسی پیچھے رہ گئی۔ اور اردو فتح مند ہو کر شاعری اور تصنیف و تالیف کی زبان بن گئی۔[1] مگر اس میں شک نہیں کہ ریختہ کے عام رواج کے باوجود اردو میں تذکرہ نویسی قدرے دیر سے شروع ہوئی۔ لطف کا تذکرہ اردو زبان میں ریختہ گوؤں کا پہلا تذکرہ ہے جو ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں گلزار ابراہیم سے ترجمہ و ترمیم ہو کر مرتب ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو کو فارسی کی گدی پر بٹھانے کی اگرچہ بہت کوشش کی لیکن فارسی کا نقش ہر خاص و عام کے دل پر اتنا مضبوط بیٹھا ہوا تھا کہ انیسویں صدی کے آخر تک فارسی ہی علم و ادب کی زبان سمجھی جاتی رہی اور باقی شعبہ ہائے علم و ادب کی طرح تذکرہ نویسی کی زبان بھی فارسی ہی رہی۔

---

[1] مصحفی ریاض الفصحا (۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء) میں لکھتے ہیں : " بہ مقتضائے رواج زمانہ آخر کار مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے اینکہ رواج شعر فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ ہم فی زمانہ بہ پایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ بلکہ از و بہتر است "۔

اُردو شاعری کی ترقی

گو کہ نظم اردو کی ابتدا مدتوں پہلے دکن میں ہو چکی تھی لیکن شمالی ہندوستان میں فارسی کے آفتاب درخشاں کے مقابلے میں اس کا ستارہ کچھ مدت تک نہ چمک سکا۔ اہل علم و کمال خان آرزو کے زمانے تک قندِ پارسی کی لذت ہائے گوناگوں کے اس درجہ والہ و شیدا تھے کہ ریختہ ان کے نزدیک بہ قول میر تقی میر "فن بے اعتبار" سے زیادہ کچھ نہ تھا۔[1] تاہم ملکی زبان کی کشش اور قبول عام اور اس میں شعر لکھنے کی آسانیوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ شعرائے ریختہ کی تعداد بڑھتی گئی اور تذکرہ نویسوں کو ان کے متعلق مستقل تذکرے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ شمالی ہندوستان میں چند تذکرے مثلاً میر کا تذکرہ نکات الشعرا (۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۰-۵۱ء) اور گردیزی کا "تذکرۂ ریختہ گویان" (۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۱-۵۱ء) اور قائم کا تذکرہ مخزن نکات (۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۱-۵۲ء) معرض وجود میں آتے ہیں[2] اور دکن میں حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ گلشن گفتار (۱۱۶۵ھ / ء)

---

[1] میر تقی میر خان آرزو کے ذکر میں فرماتے ہیں "گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ مزمودہ ایں فن بے اعتبار را کہ ما اختصار کردہ ایم اعتبار دادہ"
نکات الشعرا صفحہ ۳

۱۷۵۰-۵۱ء

[2] اس سے پہلے کے چند تذکروں کے نام بھی ملتے ہیں، چنانچہ آگے چل کر بیان ہوگا۔

اور افضل بیگ خاں قاقشال کا تذکرہ تحفۃ الشعرا (۱۱۶۵ھ) لکھا جاتا ہے جیسا کہ قدرتی طور پر ہونا چاہیئے ابتدا میں شعرائے ریختہ کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا شاعروں کی تعداد بڑھتی گئی میر کے تذکرے نکات الشعرا میں تقریباً ۱۰۰ شاعروں کا حال بیان ہوا گردیزی کے تذکرے میں بھی تعداد اتنی ہی ہے قائم کے تذکرہ مخزن نکات میں ۱۱۰ ہے۔ تذکرۂ شورش (غلام حسین) جو ۱۱۹۳ھ مطابق ۸۰ - ۱۷۷۹ء میں مرتب ہوتا ہے اشعرار کی تعداد ۳۱۴ تک پہنچتی ہے۔ عمدہ منتخبہ جو $\frac{۱۲۱۵ھ}{۱۸۰۰ء}$ اور $\frac{۱۲۴۲ھ}{۱۸۰۶ء ۔ ۱۷}$ کے درمیان مرتب ہوتا ہے کم وبیش ۱۲۰۰ اشعرار کے حال پر مشتمل ہے اسی زمانے میں عیار الشعرا خوب چند ذکا[1] جو $\frac{۱۲۰۸ھ}{۱۷۹۳ - ۹۴ء}$ اور $\frac{۱۲۴۷ھ}{۱۸۳۱ - ۳۲ء}$ کے درمیان لکھا جاتا ہے ۱۵۰۰ اشعرار کے حالات قلم بند کرتا ہے اور تذکرہ اختر جو واجد علی شاہ سے منسوب کیا جاتا ہے ۵۰۰ شعرار کے ذکر پر مشتمل ہے (اس میں فارسی شعرار بھی شامل ہیں) دتاسی اپنے خطبات[2] میں جو ۱۸۷۷ء تک کی تاریخ ادب سے متعلق ہے۔ لکھتا ہے کہ تقریباً ۳۰۰۰ شعرا کے نام میری نظر سے گزرے ہیں۔ جن میں سے میں نے اپنے تذکرے کے لئے ۸۰۰ کا انتخاب کیا ہے۔

---

[1] خطبات دتاسی صفحہ ۹۱ -

[2] خطبات صفحہ ۱۱۴ -

شاعری کے اس ذوق عام کے لئے کسی حد تک بارہویں صدی ہجری کے پولیٹکل اور سوشل حالات بھی ذمہ دار ہیں۔ اس دور کی معاشرت کا مورخ اس زمانے کے ہولناک واقعات اور خوفناک انقلابات کے اسباب ونتائج سے غافل نہیں ہو سکتا جو نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی ترکتازیوں نے ہندوستان میں برپا کیئے۔ اس سے دلّی کی مرکزیت کو شدید نقصان پہنچا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت دہلی کے کھنڈروں پر ملک کے طول و عرض میں بہت سے سیاسی مرکز قائم ہو جاتے ہیں اور دلّی کی عظیم سلطنت بٹ کر کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

اس لامرکزیت کا اثر شاعری پر بھی پڑتا ہے۔ وہ اہل کمال جو دربار معلّیٰ سے وابستہ تھے بکھر جاتے ہیں۔ کچھ خانہ نشین ہو جاتے ہیں کچھ قدردانی کی بھیک مانگنے جدید صوبائی ریاستوں کی طرف نکل جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ریاستوں کے فرمانرواؤں نے بھی ان اہل کمال کی قدردانی میں کچھ کمی نہیں کی۔ قدیم روایات کے مطابق دربار میں شاعروں کا ہونا شائستگی اور تہذیب کا لازمہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے زیر اثر ان چھوٹے چھوٹے درباروں میں بھی شاعروں کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی۔

شعرا کی کثرت کا اثر تذکرہ نگاری پر

میر غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں معاصر اسلامی سوسائٹی کا نوحہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے تمول نے مسلمانان ہند کو عیش پرست بنا کر ضعیف کر دیا ہے۔

"زیرکہ زر ہندوستان است در ہیچ ولایت نیست. کثرت تمول مردم ایں ملک را از مشق رزم باز داشتہ در عیش و عشرت بزم می اندازد" (صفحہ ۱۱۱)

یہی بزرگ مرہٹوں کے غلبے کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سبب غلبہ غنیم ایں است کہ مردم غنیم اقسام محنت برخود گوارہ کردہ مشق جنگ قزاقی می کنند و فراغت شعاران اسلام در آرام طلبی افتادہ اند" (صفحہ ۷۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عوام اور بادشاہوں کی آرام طلبی اور عیش پرستی اور "مشق رزم" کی بجائے ان کے شوق بزم نے سوسائٹی کو جد و جہد سے ہٹا کر مشاغل عیش کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور قوم میں عموماً شعر و شاعری کا ذوق و میلان پیدا ہو گیا تھا۔ طوائف الملوکی اور ذہنی انتشار کی وجہ سے نظم و نسق کی پختہ روایات درہم برہم ہو گئی تھیں اور اعلیٰ تربیت کے جملہ وسائل و ذرائع محدود و مسدود ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ

شاعری کے اس ذوق عام کے لئے کسی حد تک بارہویں صدی ہجری کے پولیٹکل اور سوشل حالات بھی ذمہ دار ہیں۔ اس دور کی معاشرت کا مورخ اس زمانے کے ہولناک واقعات اور خوفناک انقلابات کے اسباب ونتائج سے غافل نہیں ہو سکتا جو نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی ترکتازیوں نے ہندوستان میں برپا کیے۔ اس سے دلّی کی مرکزیت کو شدید نقصان پہنچا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت دہلی کے کھنڈروں پر ملک کے طول وعرض میں بہت سے سیاسی مرکز قائم ہو جاتے ہیں اور دلّی کی عظیم سلطنت بٹ کر کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

اس لامرکزیت کا اثر شاعری پر بھی پڑتا ہے۔ وہ اہل کمال جو دربار معلّیٰ سے وابستہ تھے بکھر جاتے ہیں۔ کچھ خانہ نشین ہو جاتے ہیں کچھ قدردانی کی بھیک مانگنے جدید صوبائی ریاستوں کی طرف نکل جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ریاستوں کے فرمانرواؤں نے بھی ان اہل کمال کی قدردانی میں کچھ کمی نہیں کی۔ قدیم روایات کے مطابق دربار میں شاعروں کا ہونا شائستگی اور تہذیب کا لازمہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے زیر اثر ان چھوٹے چھوٹے درباروں میں بھی شاعروں کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی۔

زمانے کی سب سے بڑی ادبی مجلسیں" تھیں[1] جن کے لئے چند در چند رسوم و آداب مقرر تھے۔ ان مجلسوں میں چھوٹے بڑے سب شریک ہوتے تھے۔ اور اہل کمال کو دل کھول کر داد دی جاتی تھی جو نوجوانوں کی تشویق کا باعث ہوتی تھی۔ ہر استاد کے ساتھ بے شمار شاگرد ہوتے تھے جو ان شاعرانہ مناظروں میں اپنے اپنے استاد کا ساتھ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس وجہ سے بہت سے ادبی گروہ قائم ہو جاتے تھے جو مختلف اساتذہ کے دبستان ادب کی حمایت پر ہر وقت کمربستہ رہتے تھے اس گروہ بندی کا عام ادب اردو پر خاص اثر پڑا۔ چنانچہ اور ادبی تحریکوں کی طرح اردو تذکرہ نگاری بھی اس سے متاثر ہوئی۔ مراختہ و مشاعرہ کی ان مجلسوں کی روداد مختصراً سب کتابوں میں ملتی ہے مگر مجموعہ نغز میں اس کی تفاصیل کچھ زیادہ ہیں۔ ان مجلسوں کو جلسہ[2] بھی کہا جاتا تھا۔ ان کا انعقاد عموماً ہر ماہ کی پندرہویں تاریخ[3] کو ہوتا تھا جس میں صاحب خانہ اپنی حیثیت اور مقدرت کے مطابق مٹھائی اور کھانے سے مہمان شعرا کی تواضع کیا کرتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک مجلس ہوتے اور اس وقت کی سوسائٹی ان کے معاملے میں کسی

---

[1] تذکرہ گلشن ہند (و گلزار ابراہیم) دیباچہ از مولانا عبدالحق صفحہ ۱۹۔ مشاعرہ کی تفصیل

[2] ریاض الفصحا مصحفی صفحہ ۲

[3] نکات الشعرا میر صفحہ ۸۳

تفاوت کو روا نہ رکھتی تھی۔[1] غرض شعر و شاعری کے اس ذوق عام نیز ادبی گروہ بندی کی وجہ سے مشاعرے کے وسیع رواج کی بدولت تذکرہ نگاری کے فن کو بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر بہت سے تذکرے معرضِ تحریر میں آ گئے۔ تذکرہ نویسی کی طرح بیاض نویسی کو بھی ترقی ہوئی جو لوگ عمدہ تذکرے نہ لکھ سکتے تھے وہ اپنے ذوق کی تشفی کے لئے بیاضیں مرتب کر لیا کرتے تھے۔ جن میں اپنی پسند کے اشعار اور غزلیں شاعر کے نام اور مختصر حالات کی قید سے جمع کر لیتے تھے۔ لیکن بیاض کے لئے کوئی خاص ترتیب مقرر نہ تھی۔ جامع اور مرتب نے جس طرح چاہا مرتب کر لیا۔ اسی طرح

---

[1] رفتہ رفتہ مشاعرہ ایک مستقل "علمی رسم" بن گئی اور اس کی روداد میں اخبار کی طرح شائع ہونے لگیں چنانچہ مولوی کریم الدین نے بھی ۱۸۴۵ء مطابق ۱۲۶۱ھ میں دلی کے مشاعرے کی منتخب نظمیں اور غزلیں چھاپنے کے لئے ایک رسالہ موسوم بہ گل رعنا شائع کرنا شروع کیا تھا جو کچھ اشاعتوں کے بعد بند ہو گیا تھا اسی طرح ۱۸۸۱ء میں ٹیا برج (کلکتہ) میں شعرائے کلکتہ کا جو مشاعرہ ہوا تھا وہ غنچہ ارم (۱۲۹۹ھ) کے نام سے شائع ہوا تھا۔ جس میں شاعروں کا کچھ حال اور ان کا منتخبہ کلام درج ہے۔

خلاصہ یہ کہ مشاعروں کے عام رواج سے جہاں اور بہت سے اچھے یا برے نتائج پیدا ہوئے وہاں اس کی وجہ سے تذکرہ نویسی کو بھی ترقی ہوئی۔

شعرا کے کلام کا انتخاب بھی ایک دل پسند چیز تھی۔ اکثر صاحبان ذوق شعرا کے کلام کا عمدہ انتخاب بے ترتیب یا کسی خاص ترتیب کے ماتحت جمع کر لیا کرتے تھے۔ جس کے ساتھ کبھی کبھی شعرا کے مختصر حالات بھی دے دیئے جاتے تھے مگر عموماً صرف نام لکھ دیا جاتا تھا۔ دتاسی نے اپنی کتاب "ہندوستانی ادب کی تاریخ" میں اور اپنے خطبات میں تذکروں کی جو طویل فہرست پیش کی ہے اس میں یہ بیاضیں اور انتخابات بھی شامل ہیں۔

تذکروں کی تقسیم

اردو تذکروں کی مفصل فہرست[1] پر نظر ڈالنے سے ہم تذکروں کو مختلف خصوصیات کے اعتبار سے مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم کر سکتے ہیں۔

اول۔ وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات جمع کئے گئے ہیں اور ضمناً کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔

دوم۔ وہ تذکرے جن میں تمام قابل ذکر شعرا کو جگہ دی گئی ہے اور مصنف کا مقصد جامعیت اور استیعاب ہے۔

سوم۔ وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعرا کے کلام کا عمدہ اور مفصل ترین انتخاب پیش کرنا ہے اور حالات کے جمع کرنے کی طرف زیادہ اعتنا نہیں۔ بیاضیں اور مجموعے اسی صنف میں شامل ہیں۔

---

[1] اردو تذکروں کی مکمل فہرست کسی ایک جگہ موجود نہیں دتا سی کی فہرستوں کے علاوہ سپرنگر کی اودھ کٹیالاگ میں بھی ہے مگر وہ مکمل نہیں۔ مولوی عبدالسلام صاحب نے شعرالہند کے دیباچے میں جو فہرست دی ہے وہ بھی مکمل نہیں۔

چہارم۔ وہ تذکرے جن میں اردو شاعری کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اور تذکرے کا مقصد شاعری کا ارتقاء دکھانا ہے۔

پنجم۔ وہ تذکرے جو شاعری کے ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں۔"

ششم۔ وہ تذکرے جو کسی وطنی یا ادبی گروہ کے نمائندے ہیں۔

ہفتم۔ وہ تذکرے جن کا مقصد محض تنقید سخن اور اصلاح سخن ہے۔

مرکزی تذکرے

ہماری تذکرہ نویسی کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس میں شاعری کی طرح "جوابیہ" کتابوں کی کثرت ہے۔ اگر ہر دور کے مختلف تذکروں کے مضامین و مندرجات کا باہم مقابلہ و موازنہ کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ہر دور میں صرف ایک دو تذکرے ایسے نکلتے ہیں جن کو ہم حقیقی معنوں میں اوریجنل کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہی تذکرے مرکزی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے جواب، تردید یا حمایت میں جس قدر تذکرے مرتب ہوئے ہیں ان کی حیثیت ضمنی ہے۔ اس موازنے میں ہم نے صرف ان مرکزی تذکروں سے بحث کی ہے جن کی بدولت فن تذکرہ نویسی کو ترقی نصیب ہوئی۔ ہم نے ضمنی تذکروں کو یا تو نظر انداز کردیا ہے یا پھر ان کا سرسری ذکر کیا ہے۔

تذکرہ نویسی کے ادوار

اردو تذکرہ نویسی اپنے ارتقائی سفر میں تین بڑے مراحل میں سے گزرتی ہے۔ میر تقی میر کی نکات الشعراء (۱۱۶۵ھ ـ ۱۷۵۰ء) پہلا بڑا سنگ میل ہے۔ دوسرا دور گلزار ابراہیم (۱۱۹۸ھ ـ ۱۷۸۴ء) سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں تذکرہ نویسی پر جدید اثرات کا پرتو پڑتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کتاب کسی حد تک جدید ماحول میں لکھی جاتی ہے اور اس میں بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جو سابقہ تذکروں میں مفقود تھی۔ کریم الدین کے تذکرہ شعرا کی اشاعت سے تذکرہ نویسی میں "لٹریری ہسٹری" کا رجحان پیدا ہوتا ہے (مخزن نکات میں بھی یہ میلان موجود ہے مگر دھیما) مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب آب حیات میں تذکرے کی خصوصیات کم سے کم پائی جاتی ہیں۔ اور یہ اردو شاعری کی پہلی حقیقی تاریخ ہے۔ مجموعی خصائص کے لحاظ سے ہم اردو تذکروں کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

طبقہ اوّل :- قدیم طرز کے تذکرے۔

الف دبستان میر۔ یعنی وہ تذکرے جو میر تقی میر کی خصوصیات تذکرہ نگاری کا تتبع کرتے ہیں۔ واقعات میں اختصار اور اصلاح سخن ان تذکروں کے امتیازات ہیں مثلاً

(۱) نکات الشعرا میر تقی میر

(۲) تذکرۂ ریختہ گویاں فتح علی حسینی
(۳) مخزن نکات قائم چاندپوری
(۴) تذکرہ میر حسن دہلوی
(۵) مصحفی کے تذکرے

(ب) دبستان میر کے خلاف ردعمل : یہ ردعمل میر کی اختصار پسندی کے خلاف ہے اور اس کا نتیجہ اختصار کی بجائے "جامعیت بلحاظ اسماء و افراد" ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ عیار الشعرا اس جامعیت کا بڑا نمائندہ ہے۔ جامعیت پسند تذکروں کی فہرست یہ ہے :-

(۱) عیار الشعراء ذکاؔ
(۲) عمدۂ منتخبہ اعظم الدولہ سرورؔ
(۳) مجموعہ نغز حکیم قدرت اللہ قاسمؔ
(۴) گلشن بے خار شیفتہؔ
(۵) گلستان بے خزاں باطنؔ

طبقہ ثانی :- جدید اثرات کے حامل تذکرے

(الف) ان تذکروں میں "سوانحیت" کا رنگ غالب ہے۔ ان میں صرف منتخب شعرا کے مفصل حالات زندگی ملتے ہیں اور واقعات کی تاریخیں بھی معین کی گئی ہیں۔ ان تذکروں کے نام یہ ہیں

(۱) گلزار ابراہیم

(۲) گلشن ہند (علی لطف)

(ب) ونا سی، کریم الدین اور صہبائی کے تذکرے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سوانحیت کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اردو شاعری کا ارتقا بھی مطالعہ میں آجائے۔

(ج) آب حیات (آزاد) تذکرہ نویسی میں لٹریری ہسٹری کا رنگ۔ بعد کے بیشتر تذکرہ نویس اس معاملے میں مولانا آزاد کا تتبع کرتے ہیں۔

اب ہم ان مباحث پر تفصیلی نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

طبقہ اول

قدیم طرز کے تذکرے

دبستان میر

نکات الشعرا شعرائے اردو کی تذکرہ نگاری کا پہلا دور جیساکہ بیان ہو چکا ہے میر سے شروع ہوتا ہے۔ میر تقی میر کو شاعری کی دنیا میں بڑی اہمیت حاصل ہے مگر تذکرہ نگاری کے فن میں بھی ان کی حیثیت کسی طرح کم نہیں۔ میدان سخنوری میں تو کئی یکہ تازان فصاحت ان سے ہم چشمی کا دعوی کر سکتے ہیں مگر اردو تذکرہ نگاری میں ان کی اولیت اور فوقیت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ جس طرح انگریزی ادب میں جانسن کے تذکرۃ الشعرا کو غیر معمولی قدر و منزلت حاصل ہے اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ میر تقی میر کے تذکرہ نکات الشعرا کی بھی فنی اور ادبی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ میر کی غزل کی طرح ان کا تذکرہ بھی ان کے لئے بقائے دوام کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۶۵ھ مطابق ۵۱-۱۷۵۰ء ہے۔ عام بیانات کے مطابق یہ شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ میر کا اپنا

بیان بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

"ورفن ریختہ کہ شعرے است بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلّی شاہ جہان آباد کتابے تاحال تصنیف نہ شدہ کہ احوال شاعراں این فن بصفحہ روزگار بماند" (صفحہ ۱)

دتاسی کا قیاس ہے کہ میر کے تذکرے سے پہلے بھی کئی تذکرے موجود ہوں گے[1] ادھر قائم کا دعویٰ ہے کہ

"الی الان در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابے تصنیف نگردیدہ و تا این زمان ہیچ انسانے۔ از ماجرائے شوق افزای سخنوران ایں فن سطرے بتالیف نرسانیدہ۔"[2]

مگر یہ دعویٰ غلط ہے۔ کیوں کہ محمد شاہی اور احمد شاہی دور کے بعض تذکروں کا ذکر کتابوں میں آیا ہے اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں سے کچھ تذکرے میر اور قائم کے تذکروں سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ وہ تذکرے جو ۱۷۵۲ء میں یا اس سے پہلے تصنیف ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ تذکرہ سید امام الدین خاں (عہد محمد شاہ)

۲۔ تذکرہ خان آرزو۔

---

[1] خطبات دتاسی صفحہ ۴۷-۱۴۷۔

[2] مخزن نکات قائم صفحہ ۱۔

۳۔ تذکرۂ سودا

۴۔ معشوق چہل سالہ خود نوشتہ خاکسار (۱۱۶۵ھ)

۵۔ تحفۃ الشعرا مؤلفہ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی (۱۱۶۵ھ)

۶۔ گلشن گفتار مؤلفہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی (۱۱۶۵ھ)

مذکورہ بالا تذکروں میں سے پہلے چار تذکرے ناپید ہیں۔ موخر الذکر دو تذکرے دکن سے متعلق ہیں۔ مخزن نکات اپنے دعویٰ کے باوجود بعد کی تصنیف ہے اور ۱۱۶۸ء میں لکھا جاتا ہے۔ باقی رہا تذکرہ گردیزی سو داخلی شہادتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ گردیزی نے میر کے تذکرہ نکات الشعرا کو ضرور دیکھا ہوگا۔ پس ان حالات میں تذکرۂ میر کو اردو شاعروں کا پہلا "موجود" تذکرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

نکات الشعرا کے امتیازات

نکات الشعرا کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اردو تذکرہ نویسی پر گہرا اثر ڈالا۔ فخر اولیت کے علاوہ اس کو یہ عظمت بھی حاصل ہے کہ اردو تذکرہ نویسی آج تک اس کے اثر سے آزاد نہیں ہوسکی۔ زمانہ تصنیف سے لے کر آج تک کڑی سے کڑی تنقید اور سخت سے سخت مخالفتوں کے باوجود تذکرہ میر کا اثر روز بہ روز بڑھتا جاتا ہے اور اس کے نکتہ چین جس قدر اس کے طلسم واثر کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی قدر اس کے قبول عام میں ترقی ہوتی جاتی ہے

اس تذکرے کے ناقدین کی صف میں ہمیں بڑے بڑے لوگ نظر آتے

ہیں اس معاملے میں میر کا پہلا حریف سید فتح علی حسینی گردیزی (صاحب تذکرہ ریختہ گویاں) تھا جس نے نکات الشعرا کا جواب لکھا اور میر کی طرز تنقید کو "خردہ گیری" اور "عیب چینی" کا نام دیا۔

"علت غائے تالیف شاں خردہ گیری، ہم سراں دستم ظریفی با معاشران است۔ در اظہار ما فی نفس الامر بایجا نر پرداختہ بلکہ از جہت عدم اغنا دہ قلت تتبع ..... اکثر نازک خیالان رنگیں نگار را از قلم انداختہ۔ مع ہذا در تصحیح اخبار وتحقیق احوال اعزہ اغلاط صریح بکار بردہ وخطاہائے نمایاں کردہ اند"

گردیزی نے میر کی دیانت اور مصنفانہ اخلاق پر جو حملہ کیا ہے اس کی موزوں تردید خود زمانے نے کر دی ہے۔ گردیزی نے میر کے خلاف بظاہر جذبہ انتقام سے مجبور ہو کر جو زہر اگلا ہے اس کا آنے والی نسلوں پر کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ بہ قول مولانا عبدالحق[۵۱]

"انتقام لینے والا ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے میر کو گرانے کی کوشش بے سود ثابت ہوئی"

گردیزی کے علاوہ خاکسار، حکیم قدرت اللہ قاسم شفیق اورنگ آبادی مولوی کریم الدین اور مولانا آزاد[۵۲] بھی میر صاحب کے مخالفین میں سے ہیں۔ میر

---

۵۱ دیباچہ مجموعہ نغز
۵۲ محمد حسین آزاد

محمد یار عرف کلن (متوفی ۱۸۰۵ء) نے تذکرۂ خاکسار کے نام سے نکات کا جواب لکھا۔ جس میں میر صاحب کو بہت برا بھلا کہا ہے اس کے جواب میں میر نے بھی اپنے تذکرے میں خوب دل کھول کر سنائی ہیں۔ "الغرض بسیار کم فرصت بے تہ است" کہہ کر درسخن بند کر دیا ہے۔

حکیم قدرت اللہ[1] قائم مصنف مجموعہ نغز بھی میر صاحب سے بہت خفا ہیں۔ پروفیسر شیرانی جنھوں نے مجموعہ نغز کو ایڈٹ کیا ہے صحیح کہتے ہیں[2] کہ "آب حیات میں میر صاحب کی سیرت کی جو بدنما تصویر اتاری گئی ہے اس کے بعض رنگ حکیم صاحب ہی کے تیار کردہ ہیں۔" حکیم قائم، میر صاحب کے ذکر میں لکھتے ہیں[3]:

"از کبر و غرورش چہ برطرازم کہ حدے ندارد و از نخوت
و خودسریش چہ برنگارم کہ سینۂ قلم حقائق رقم می فگارد۔"

ان بزرگوں کی طرح شفیق اورنگ آبادی نے بھی چمنستان شعرا[4] میں یقین کی حمایت کے جوش میں گردیزی کے الزامات کو دہرایا ہے۔ مولوی کریم الدین نے طبقات الشعرا میں اور مولانا آزاد نے آب حیات میں میر صاحب کو مطعون کیا اور ہدف ملامت بنایا ہے۔ مولانا آزاد کی تنقید کا اندازہ یہ

۱؎ دیباچہ مجموعہ نغز

۳؎ صفحہ ۱۶۶

۲؎ مجموعہ نغز ج ۲ صفحہ ۲۳۰

ہاہے۔

" دیباچے میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے زمانہ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بے چارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا[1] "

میں نے میر صاحب کے ناقدین کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ نکات الشعرا کے خلاف از آغاز تا حال جو سخت تنقیدیں ہوتی رہی ہیں ان سے میر تقی کی عظمت اور ان کے تذکرے کی اہمیت میں فرق آنے کی بجائے اس کے قبول اور وسعت اثر میں اور ترقی ہوتی رہی۔ اس کو مبدۂ فیاض کا فیض خاص سمجھنا چاہیئے۔ یہ اس تذکرے کی فنی اور اندرونی خوبی ہے کہ اس کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنے والوں کو ہمیشہ ناکامی رہی۔ یہاں تک کہ مولانا محمد حسین آزاد کو بھی مولنا حبیب الرحمن خاں شیروانی کی زبان سے چند درشت (گو درست) باتیں سننا پڑیں۔ مولانا شیروانی کہتے ہیں کہ نکات الشعرا کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ " اب بہت کمیاب ہے " (صفحہ ۱۹۲ آب حیات) " لیکن میری بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا۔ کہ نکات الشعرا آزاد کی نظر سے نہیں گذرا۔ قیاس کی بلند

---

[1] آب حیات صفحہ ۱۹۵ کریم الدین کی تنقید کے لئے دیکھو تذکرہ کریم الدین صفحہ ۹

پروازی نے طوطے بینا اڑائے ہیں[۱]

تنقید میں "بے دردی" اور تلخی

تذکرہ میر کی امتیازی خصوصیت اس کی تلخ تنقید ہے وہ "اندھی اور بہری عقیدت" جو قدیم مشرقی اخلاق کا ایک جزو ہے اور وہ عام رواداری جو اکثر معاملات میں "ہیرو" کے معائب بیان کرنے سے سوانح نگاروں کو روکتی رہی ہے، نکات الشعرا میں عموماً مفقود ہے۔ تنقید اور سیرت نگاری میں بے لاگ اور رعایت اظہار رائے لوازم دیانت میں سے ہے اور اگر کوئی سیرت نگار یا نقاد اپنے موضوع کی حقیقی تصویر کشی نہیں کرسکتا تو بہ قول ڈاکٹر جانسن[۲] اسے ایسے موضوع کو ہاتھ ہی نہیں لگانا چاہیئے۔

"When it is painful to tell the truth the story must not be told"

نکات میں توقع کے خلاف تنقیدی مواد کافی سے زیادہ موجود ہے اور تنقید سخن کے علاوہ مختلف اشخاص کی سیرت کے متعلق اس قدر سچی

۱۔ نکات الشعرا دیباچہ از مولٰنا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صفحہ ۲

۲۔ Aspects of Biography By Andre Maurois p. 20

برہنہ اور واشگاف رائیں پائی جاتی ہیں کہ ان کو پڑھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ یہ بات ایک تو یوں بھی زمانے کی فضا کے خلاف تھی اس پر مستزاد یہ کہ معاصرین پر رائے زنی کرتے ہوئے میر نے کسی کی دل شکنی کی مطلق پروا نہیں کی۔ مگر میر کی عام سیرت میں غرور اور خود بینی کا عنصر بھی تھا جس کی وجہ سے ان کے اکثر معاصرین ان سے شکایت گزار ہیں۔ اگر میر کی تنقیدوں کو ان کی سیرت کی اس خصوصیت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو پھر شاید میر کے معاصرین کی شکایت کو حق بہ جانب قرار دینا پڑے گا۔ بعض شعرا کے ذکر میں میر صاحب کا لب و لہجہ طنز آمیز اور تلخ ہے جس سے تنقید میں تلخی ہی نہیں بلکہ شدید بے دردی پیدا ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے اس خیال کی تائید نہیں کر سکتے کہ

"تمام تذکرے میں ایک لفظ بھی میر صاحب کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے ان کی خود بینی و خود پسندی یا بد دماغی اور تعلی عیاں ہو"

شاعری پر میر صاحب کی نکتہ چینی درست سہی مگر وہ تو شعرا کی سیرت نگاری میں بھی تلخ نگاری کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مثلاً حاتم کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مردے است جاہل و متمکن و مقطع وضع، دیر آشنا غنا ندارد در یافتہ نمی شود کہ این رگ کہن بہ سبب شاعری است کہ ہمچو من دیگرے نیست یا وضع او ہمین است۔"

حاتم کے ایک شعر کی اصلاح کرتے ہیں مگر اس میں تنقید سے گزر کر تنقیص بلکہ بد مذاقی تک اتر آتے ہیں۔ حاتم کا شعر یہ ہے۔

ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا ۔۔۔ آگے آیا مرے کیا میرا

اس شعر کی یوں تحریف کرتے ہیں۔

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں ۔۔۔ آگے آیا مرے کیا میرا

پھر اس پر خود ہی رائے ظاہر کرتے ہیں" پیش گرمئی این مصرع وخنکئے آں شعر روشن است"[۱] حاتم کی شاعری اور سیرت کے متعلق یہ خوفناک رائے ظاہر کرنے کے بعد ان کے کلام کا انتخاب تو دیا ہے لیکن اس کے اصل کارنامہ حیات یعنی اصلاح زبان کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ میر حسن دہلوی جو بہت حد تک ان ادبی جانب داریوں سے پاک اور الگ تھلگ سے ہیں حاتم کا ذکر یوں کرتے ہیں: "صاحب کمال پسندیدہ افعال عالی فطرت بلند ہمت"[۲] حاتم مرزا رفیع سودا کے استاد تھے جو میر صاحب کے حریف تھے۔ شاید ان سے میر صاحب کے بگاڑ کی وجہ بھی یہی ہو۔

انعام اللہ خاں یقینؔ کی شاعری اور سیرت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے[۳]۔ ممکن ہے اس کو حقیقت سے کچھ لگاؤ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا

۱۔ نکات الشعرا صفحہ ۸۰
۲۔ تذکرہ میر حسن ذکر حاتم
۳۔ نکات الشعرا صفحہ ۸۵

کہ میر کا لہجہ نہایت سخت ہے۔ مشاعروں کی مجلسوں میں رد و قدح کی جو اسپرٹ پیدا ہو سکتی ہے اور رقابت اور مسابقت کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اس کا اثر میر صاحب کی تحریروں سے صاف ظاہر ہے۔ چنانچہ وہ سرے سے یقین کے شاعر ہونے سے ہی انکار کرتے ہیں اور "ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد" کہہ کر اس کی شاعری کے سارے دفتر کو خاک میں ملا دیتے ہیں اس خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ معتدل اور منصفانہ رائے میر صاحب کا ساتھ نہیں دیتی چنانچہ مصحفی جنہیں میر صاحب کی جماعت کا آدمی سمجھنا چاہیئے اپنے تذکرے میں حاتم کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں[1]:

"در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسید"

ایسے باکمال شخص کی شاعری سے ہی منکر ہو جانا میر صاحب کی زبردستی اور ستم ظریفی ہے۔ پس جہاں حاتم اور یقین میر صاحب کی تیغ زبان سے بچ نہ سکے ہوں وہاں محمد علی حشمت، محمد یار خاکسار (عرف کلن) یکرو اور اس طرح کے درماندگانِ کوچہ شعر کیسے بچ کر نکل جاتے۔

واقعہ یہ ہے کہ میر صاحب کی نقادانہ عظمت کو ان کی سیرت کی اس خامی سے سخت نقصان پہنچا ہے۔ فطرتاً انہیں نقد و نظر کی بے نظیر استعداد

---

[1] مصحفی ذکر حاتم

عطا ہوئی تھی لیکن انہوں نے طبیعت کی افسردگی اور غلبہ غم کے زیر اثر اپنی اس شاندار صلاحیت کو بے دردی سے اور تلخی کی صورت دے کر برا نقصان پہنچایا۔ ان سے بلا شبہ یہ نہ ہو سکا ہو گا کہ وہ جرأت اور انشا کی شوخیوں اور مرزا سعادت یار خان کی جدت پسند طبیعت کی رنگینیوں کو سن کر داد سخن دیں اور قہقہوں کی آوازوں میں خود بھی آواز ملائیں[1] مگر ان کے لئے یہ بھی مناسب نہ تھا کہ وہ اپنی تنقیدوں میں تنقیص اور تحقیر کا یہ انداز پیدا کر لیتے ان کی بعض تنقیدوں میں غم و غصہ کے آثار نظر آتے ہیں اور یہ ایک نقاد کے لئے ایسا عیب ہے جس کو روا نہیں رکھا جا سکتا۔

میر صاحب اور آزاد

باایں ہمہ میر صاحب کی تنقیدوں کے بارے میں آزاد کا ہم نوا ہونا بھی مشکل ہے۔ آزاد کی رائے بہت حد تک ناانصافی اور ناواقفیت پر مبنی ہے۔ مجموعہ نغز کے شائع ہو جانے سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ تذکرہ نکات الشعرا آزاد کی نظر سے نہیں گزرا تھا اس لئے ان کا یہ خیال کہ میر صاحب نے ہزار شعرا کے حالات لکھنے کا دعویٰ کیا ہے لیکن ان ہزار میں ایک بے چارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا[2] ایجاد بندہ سے کم نہ نکلا باقی رہا میر صاحب کا یہ دعویٰ کہ میرا تذکرہ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔ کاملاً درست نہ سہی مگر

---

[1] گل رعنا صفحہ ۱۶۱

[2] آب حیات صفحہ ۱۹۵

تعجب تو یہ ہے کہ آزاد نے بھی تو اس دعوے کی تردید میں کوئی قطعی ثبوت پیش نہیں کیا۔

میر صاحب اور شعرائے دکن میر صاحب نے شعرائے دکن پر سخت لے دے کی ہے اور لکھا ہے کہ

,,اگرچہ ریختہ در دکن است، چوں از آنجا یک شاعر مربوط نخاستہ لہذا شروع بنام آنہا نکردہ وطبع ناقص مصروف ایں ہم نیست کہ احوال اکثر آنہا ملال اندوز گردد"

ایک اور مقام پر شاعران دکن کو "پُر بے رتبہ" کہا ہے اور ان کے مفصل حالات پیش کرنے سے احتراز کیا ہے لیکن یہ وہ مسئلہ ہے جو اردو ادب کے مسائل مبہمہ میں سے ہے جس میں میر صاحب کو غلط یا صحیح کہنا آسان نہیں دلّی میں دلی کے اثر کے باوجود جس قسم کی شاعری رواج پذیر ہوئی اور ناقدین اور مصلحین نے شعر میں جو اصلاحات کیں ان سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دکنی اثرات کے خلاف بغاوت اس زمانے کا ایک اہم ادبی رجحان تھا۔ مرزا جان جاناں مظہر، شاہ مبارک آبرو۔ میر تقی اور میرزا رفیع سودا نے اردو شاعری کو فارسی شاعری کے رتبے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ فارسی شاعری کو اس کی شاندار ماضی کی وجہ سے بہت بڑی عظمت حاصل تھی چنانچہ قدرتی طور پر شعرائے اردو نے فارسی شاعری کی تقلید کی اور اپنے ادب و شعر کو ناگوار ہندی عناصر سے پاک کرنا چاہا۔ لہذا وہ تمام شاعری جو دکن اور گجرات میں پیدا ہوئی۔ شیوا بیانان شاہ جہاں آباد کی

نظر میں گری ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے تذکرہ نگار (سوائے معدودے چند بڑے شاعروں کے) عام شعرائے دکن کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہی اس زمانے کا عام رجحان تھا اور یہی میر تقی میر کا مسلک تھا اس میں کوئی بات غیر معمولی نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ میر نے ولی کا ذکر اس کی شان اور بڑائی کے مطابق نہیں کیا اور اتنا ہی کہہ کر قصہ ختم کر دیا ہے کہ

"از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد و احوالش کما ینبغی معلوم من نیست"۔

بلاشبہ اس سے ولی کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ولی از روئے استحقاق اس سے بہتر سلوک کے مستحق تھے اور حق یہ ہے کہ اگر اس طرزِ بیان کو عدم اعتراف کے مرادف سمجھ لیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ولی کے رتبہ شاعری کو سمجھنے سے میر قاصر رہے ہیں لیکن اس سلسلے میں اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ نکات الشعرا کے حالات کے بارے میں علی العموم اختصار ہی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ مفصل حالات بھی دستیاب نہیں ہوئے۔ چنانچہ صاحب مخزن نکات شعرائے دکن کے حامی ہونے اور میر صاحب کے اس معاملے میں مخالف ہونے کے باوجود ان کے حالات (میر سے زیادہ) لکھ نہیں سکے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی یہ رائے قابلِ غور ہے کہ میر صاحب

ل دیباچہ نکات الشعرا صفحہ ۹۔

نے اپنے تذکرے میں ذاتی تعلقات اور تنقید کلام میں ایک حد فاصل قائم کر رکھی ہے۔ چنانچہ جن شعرا کی شاعری کو وہ وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے ان کی سیرت کی تصویر کشی میں بھی عموماً بے انصافی سے کام نہیں لیا۔ یقین کی شاعری کو جہاں بے مصرف قرار دیا ہے۔ وہاں ان کی شرافت اور بزرگی کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح میر علی نقی کے کلام کو "اوباشانہ" مگر ان کی "بزرگی اور بزرگ زادگی" کو تسلیم کیا ہے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود میر کی تنقید بے دماغی اور بد دماغی کے اثرات سے نہ بچ نہیں سکی۔ میر صاحب کی تنقید پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی تنقیدیں کسی ہمدرد ڈاکٹر کے عمل جراحی سے مشابہ نہیں بلکہ بعض اوقات ان کی حیثیت قاتلانہ حملے کی ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاتھ میں نشتر نہیں خنجر ہے جو کسی مدعیٔ اصلاح کا ہتھیار نہیں ہو سکتا۔ ہاں کسی قاتل کا خوفناک اسلحہ ہو سکتا ہے۔

نکات الشعرا میں میر صاحب نے جو پوسٹ مارٹم کئے ہیں ان کے مضر پہلوؤں سے قطع نظر ان کا ایک مفید پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ نکات الشعرا کی "قاتلانہ" تنقیدوں نے ارزاں اور کم پایہ ادب کو بڑھنے سے روک دیا اس کے زیر اثر بڑے بڑے شعرا کو اپنی شاعری پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی اور میر جیسے نقادوں کے جائزہ سے پہلے انہوں نے خود اپنے دیوانوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ نکات میں ادبی گروہ بندی اور عصبیت کے آثار بھی ملتے ہیں لیکن نکات نے تنقیدی ذوق

کی تربیت میں جو نمایاں حصہ لیا اس سے ادب اور شاعری کو معتدبہ فائدہ پہنچا۔

اصلاح سخن نکات کا ایک اور امتیازی وصف اصلاحِ سخن اور حسن انتخاب کلام ہے۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے میں مختلف شعرا کے اشعار میں جو اصلاحیں کی ہیں ان سے ان کے اعلیٰ ذوق اور بے نظیر سخن فہمی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اصلاحیں کہیں تو زبان سے متعلق ہیں اور کہیں مضمون سے۔ ہو سکتا ہے کہ ذوق کا اختلاف بعض مقامات پر ہمیں ان سے اختلاف کرنے پہ مجبور کر دے لیکن ان کا عام انتخاب اتنا عمدہ اور دل پسند ہے کہ وہ ہر تربیت یافتہ مذاق کے لئے قابل قبول اور قابل توجہ ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے انتخاب کے خلاف بعض لوگوں کو شکایت بھی پیدا ہوئی۔ مگر شکایت یہ نہیں کہ ان کا انتخاب برا ہے بلکہ یہ ہے کہ انہوں نے انتخاب کم کیا ہے۔

مولوی کریم الدین[1] نے بھی یہی شکایت کی ہے اور باقی معترضین کو بھی یہی گلہ ہے۔ مگر اس سے انکار کرنا مشکل ہو گا کہ میر کا انتخاب بہت اچھا ہے اعلیٰ مذاق کے مطابق ہے۔ اشعار کی کمی کی شکایت درست بھی ہو تب بھی اس کو ادبی کوتاہی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

---

[1] تذکرہ کریم الدین صفحہ ۹

تصویرِ سیرت ہمارے نزدیک نکات کا شان دار ترین وصف اس کی سیرت نگاری ہے۔

English Biography in the 18th century

میں لانگیکر نے لکھا ہے[1] کہ تذکرہ رجال میں مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اشخاص کے واقعات زندگی کو ایسے پر معنی ایجاز و اختصار سے بیان کرے جس سے ان اشخاص کی پوری تصویر سیرت آنکھوں میں پھر جائے۔ ایک بیاگرافی' اور بیاگرافیکل ڈکشنری" میں یہی فرق ہوتا ہے کہ بیاگرافی میں سوانح نگار ایک فرد کی مفصل ترین اور جامع ترین سرگزشت بیان کرتا ہے اس کے برعکس کسی، معجم، یا قاموس تراجم (بیاگرافیکل ڈکشنری) میں گنجائش کے کم ہونے کی وجہ سے اختصار سے کام لینا پڑتا ہے۔

Conciseness is the virtue to which all must be sacrified.

نکات الشعرا کی "سیرتوں" کو اگر اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم اس کے اختصار و ایجاز میں وہ معنویت اور مصورانہ دقت نظر پاتے ہیں جو تفصیل میں نہیں مل سکتی۔ مثلاً چند سیرتوں کے خاکے ملاحظہ کیجیے۔

---

[1] تذکرہ کریم الدین۔ صفحہ ۲۲۸

قزلباش خاں امید کی سیرت کو بیان کرنے کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ یہ ہیں :-

" مردے مغلے بود ، شاعر غرائے فارسی نکتہ پرداز بذلہ سنج ، کوچک دل عزیز دلہا یار باش خوش اختلاط ہمیشہ خنداں و شگفتہ رو لبسر برد - داخل ذیل امرا بود و در ہر سیر و تماشای رفت و صحبتہا می داخت - (ص ۷)

میاں شرف الدین مضمون ظریف ظریف ہشاش بشاش ، ہنگامہ گرم کن مجلسہا ، ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ .... (ص ۱۶)

مصطفے خاں یکرنگ " بسیار چسپاں اختلاط و آشنائے درست بود ... "

(ص ۱۹)

محمد شاکر ناجی جوانے بود " آبلہ رو سپاہی پیشہ ، مزاجش بیش تر مائل بہزل ... شعر ہزل خود می خواند و مردماں را بخندہ آورد و خود نمی خندید مگر گاہے بتبسمے می کرد ... "

مرزا رفیع سودا جوانے ست خوش خلق و خوش خوئے گرم جوش یار باش شگفتہ

روئے ... (ص ۳۲)

کرم اللہ خاں درد "بسیار خوش فکر و عاشق سخن، خالی از درد مندی نیست، خوب می گوید و خوب می فہمد ... طبع شور انگیزے دارد مرد خوش است خدا اش زندہ دارد۔" (ص ۸۷)

شیخ محمد حاکم "مردے است جاہل و متمکن و مقطع وضع، او بیرآشنا غنا ندارد۔ درد یافتہ نمی شود کہ این رنگ کہن بسبب شاعری است کہ ہمچو من دیگرے نیست یا وضع او ہمیں است ... با من ہم آشنائے بیگانہ است۔

مکھن پاکباز تخلص شخصے است گوشہ نشیں، شاگرد میاں یکرنگ کہ احوالش نوشتہ آمد ... بسیار کم اختلاط گویا آشنا شدن را نمی داند ... مزاجش خالی از وحشت نیست ...

میاں شہاب الدین ثاقب تخلص مردے درویش است متوکل ... تحفہ روزگار داشت ہر چہ بہم می رسید بہر چیز دست دارد ہیچ نمی داند حاصل مردے خوبے است زندہ باشد ...

میر عبدالحی تاباں نوجوان بامزہ بود، سید نجیب الطرفین ... بسیار خوش فکر و خوبصورت خوش

خلق پاکیزہ سیرت معشوق عاشق مزاج تا حال در فرقۂ شعرا
ہمچو او شاعر خوش ظاہر از مکمن بطون عدم بعرصۂ ظہور
جلوہ گر نہ شدہ بود۔

میں نے سطور بالا میں سیرتوں کے جو خاکے پیش کیے ہیں ان میں سے بعض اپنے اختصار کے باوجود اتنے جامع اور پر معنی ہیں کہ ان سے ان اشخاص کی پوری پوری سیرت خیال میں آجاتی ہے۔ مثلاً یار باش، خوش اختلاط، ہنگامہ گرم کن مجلسہا، چپاں اختلاط خالی از دردمندی نبود دیر آشنا، آشنائے بیگانہ، مقطع وضع وغیرہ وغیرہ سے سیرت کے بعض پہلو کتنی عمدگی سے روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں حد درجے کا اختصار ہے مگر ایک تذکرے میں اس سے زیادہ تفصیل نہ ممکن ہے نہ مناسب ہے۔

نکات الشعرا کے نقائص

نکات الشعرا کا تذکرہ نویسی پر جو پائدار اور نہ مٹنے والا اثر پڑا اس کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجملاً نکات کی بعض کمزوریوں کا بھی ذکر کیا جائے۔ بیاگرافیکل ڈکشنری کے لئے اختصار اگرچہ ضروری ہے لیکن یہ اختصار کھوکھلا نہیں ہونا چاہئے۔ تذکرے میں تمام ضروری واقعات اور جزئیات کے اشارے لازمی ہیں۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ میر کا اجمال بعض اوقات قابل اعتراض حد تک جا پہونچتا ہے اور یہ اجمال کھوکھلاپن کے مترادف بن جاتا ہے۔ اس میں تمام ضروری معلومات

آجانی چاہئیں علی الخصوص سنین کی تعیین نہایت ضروری ہے۔ میر صاحب نے نکات میں شعرا کی ولادت اور وفات کی تاریخیں نہیں دیں اس کے علاوہ نکات کی ترتیب بھی انوکھی ہے اس کی ترتیب نہ کا ملاً تاریخی ہے نہ ابجدی نہ ابتثی۔ میر صاحب کے مدنظر ایک نیم تاریخی ترتیب ہے جس سے ترتیب کے بنیادی مقاصد پورے نہیں ہوتے۔

ان نقائص کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نکات الشعرا میں پیش کردہ معلومات اگرچہ مجمل ہوتی ہیں مگر عموماً لائق اعتماد ہوتی ہیں اس لحاظ سے نکات الشعرا لنگے کر کے مندرجہ ذیل اصول کا اچھی طرح پابند ہے ــــ"

The aim of this from (Biog. Dictionary) is offering of reliable information in a compact way.

(p. 237)

اس سلسلے میں یہ واضح رہے کہ دبستان میر کے جتنے تذکرے ہیں ان میں یہ خوبیاں اور یہ نقائص کم و بیش موجود ہیں۔

نکات الشعرا کا اثر اور ردعمل

میر تقی میر کو خواجہ میر درد کے الفاظ میں بزم شاعری کا "میر مجلس" مانا جائے یا نہ مانا جائے۔ تذکرہ نویسی کی انجمن کے میر مجلس یقیناً وہی ہیں۔ شاعرانہ عظمت سے قطع نظر اس نوع تصنیف میں ان کی اولیت بجائے

خود ایک بہت بڑا امتیاز ہے اور حق یہ ہے کہ ان کی بے لاگ تنقید اور پہلودار طنز نے ان کے تذکرے کو دوست دشمن دونوں کی نظر میں اتنا اہم بنا دیا ہے کہ اس کے اثر اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا نکات الشعرا نے اپنے دور کے ادبی رجحانات کو بے حد متاثر کیا۔ اس کی تائید میں کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے جواب اور تردید میں بہت سے تذکرے مرتب کئے گئے۔

فن تذکرہ نویسی میں جو اسلوب میر نے قائم کیا بعد میں آنے والوں نے اس کا تتبع کرنے کی کوشش کی۔ ان کے معاصرین مثلاً گردیزی اور قائم نے نکات کی ترکیبیں اور عبارتیں تک اڑا ئیں اس سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے لکھنے والے نکات الشعرا کے رعب اور اثر سے حد درجہ مغلوب تھے۔

نکات لے آنے والے تذکروں پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ ایک صدی کے بعد تک محمد حسین آزاد اور ان کے بعد کے تمام قابل ذکر تذکرے اس اہم ماخذ کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ وہ تذکرے جو نکات الشعرا سے متاثر ہوئے یہ ہیں۔

(۱) تذکرہ ریختہ گویاں از فتح علی حسینی گردیزی (۱۱۶۶ھ)

(۲) مخزن نکات از قیام الدین قائم چاندپوری (۱۱۶۸ھ)

(۳) تذکرہ حیرت (۱۱۷۴ھ)[۱]

---

[۱] سپر نگمہ صفحہ ۱۷۵۔

(۴) تذکرہ شورش از سید غلام حسین عرف بھیتا (المتوفی ۱۱۹۵ھ)[1]

(۵) تذکرہ خاکسار[2] (یا معشوق چہل سالہ) نکات کے خلاف اس وقت لکھا گیا تھا جب میر صاحب ابھی بقید حیات تھے۔ مصنف کا نام محمد یار عرف کلن یا کلو تھا۔

(۶) چمنستان شعرا از شفیق اورنگ آبادی (۱۱۷۵ھ) نکات الشعرا کا ذکر کرتا ہے اور اس کے بیانات کی تردید کرتا ہے۔

(۷) مجموعہ نغز از قاسم (۱۲۲۱ھ) میر کے تذکرے پر سخت نکتہ چینی کرتا ہے۔

(۸) تذکرہ میر حسن (۱۱۸۸ - ۱۱۹۲ھ) میر کے بعض اسالیب کی پیروی کرتا ہے۔

(۹) تذکرہ آب حیات از مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۸۰ھ) اس میں مجموعہ نغز کے بیانات کے زیر اثر نکات الشعرا پر سخت حملے کئے گئے ہیں۔

ان تذکروں میں سے گردیزی اور قائم کے تذکروں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا جائے گا۔ حیرت۔ شورش اور خاکسار کے تذکرے میری

---

[1] سپرنگر صفحہ ۱۸۲ و خطبات دتاسی (اردو) صفحہ ۸۰۔

[2] تذکرہ ہندی میں مصحفی نے لکھا ہے، "گویند کہ محمد تقی میر در عالم شباب منظور نظر او بود۔" صفحہ ۸۸

نظر سے نہیں گزرے۔ سپرنگر نے اول الذکر دو کے متعلق لکھا ہے کہ یہ میر کے تذکرے پر مبنی ہیں۔ تذکرہ خاکسار کا ذکر خود میر صاحب نے نکات میں کیا ہے۔ غالباً اس کی افادی حیثیت بالکل صفر تھی یہ محض میر صاحب کا جواب تھا۔ صاحب چمنستان کو خود اقرار ہے کہ اس نے میر اور گردیزی کے تذکرے دیکھے ہیں۔

"دریں اثنا تذکرہ نکات الشعرا من تصنیف میر تقی میر و تذکرہ فتح علی خاں تازہ از ہندوستان نزول نمودہ شورے در عالم انداختند ؎"

اس تذکرے کی ترتیب میں میر غلام علی آزاد کے فارسی تذکروں کے علاوہ حاکم لاہوری کے تذکرہ مردم دیدہ وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے حالات مفصل ہیں اور تاریخیں بھی عام طور پر دی گئی ہیں۔ میر صاحب اور گردیزی کے تذکروں سے منتخب اشعار لئے ہیں۔ اور میر کی رائے کے برعکس حاکم اور یقین کی حمایت کی گئی ہے اور میر صاحب کی ان پر خورد گیری اور عیب چینی کی مذمت کی گئی ہے۔ صاحب چمنستان نے میر صاحب کے متعلق سودا کا ایک قطعہ بھی نقل کیا ہے جس کے آخری دو شعر یہ ہیں ؎

ؔ چمنستان ص ۳۷۲

؎ وایضاً ، ۱۶۶ تا ۱۷۰

ہے جو کچھ نظم و نثر دنیا میں | زیر ایراد میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے "میر" کی اصلاح | لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

شفیق نے میر صاحب کی خوردہ گیری کو اگرچہ بہت لائق مذمت قرار دیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ اس کا بیشتر سرمایۂ معلومات اور اشعار کا انتخاب (علی الخصوص شمالی ہند کے شعرا کے متعلق) میر تقی کے تذکرے ہی سے ماخوذ ہے۔

مجموعۂ نغز حکیم قدرت اللہ قاسم کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں اس کے سلسلے میں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ تذکرہ بھی اپنی سخت مخالفت کے باوجود اثرات میر سے بے نیاز نہیں ہو سکا۔ چنانچہ باقی اثرات کے علاوہ سیرت کی تصویر کشی کے معاملے میں میر کے انداز بیان کا عام تتبع کرتا ہے۔

تذکرۂ ریختہ گویاں یہ تذکرہ سید فتح علی حسینی گردیزی نے ۱۱۶۶ ہجری[۱] میں مرتب کیا۔ (گردیزی کا انتقال ۱۱۷۲ھ میں ہوا) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تذکرہ نکات الشعرا شائع ہوا تو باقی بہت سے معاصرین کی طرح گردیزی کو بھی میر صاحب کی تنقیدیں ناگوار گذریں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ آرزو اور حزین کی

---

[۱] دیباچہ از مولانا عبدالحق۔ ص ۱۷ اسپرنگر نے ۱۱۶۵ھ لکھا ہے۔ ص ۱۵۸۔

مشہور نزاع میں گردیزیؔ مؤخر الذکر کے حامی تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان کی حمایت میں ایک رسالہ ابطال الباطل بھی لکھا تھا۔ ادھر میر تقی میر جو آرزو کے عزیز اور شاگرد تھے، آرزو کی جماعت سے متعلق تھے۔

ممکن ہے کہ میر اور گردیزی کے مابین اس وجہ سے بھی اختلاف پایا جاتا ہو مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ گردیزی نے میر کے بعض بیانات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جن کی تلخی کی شکایت ان کے علاوہ اور لوگوں کو بھی تھی چنانچہ گردیزی کا گلہ خود ان کی زبان سے سنئے۔

"از ملاحظہ تذکرہ ہائے اخوان زمان کہ مشتمل براسامی ریختہ گویان عہد محرر ساختہ اند و علت غائے تالیف شاں خوردہ گیری ہمسراں و ستم ظریفی با معاصران است در اظہار ما فی نفس الامر بایجاز پرداختہ بلکہ از جہت عدم اعتنا و قلت تتبع اکثر نازک خیالاں رنگین نگار را از قلم انداختہ مع ہذا در تصحیح اخبار و تحقیق احوال اعزہ اغلاط صریح بکار بردہ و خطا ہائے نمایاں کردہ اند، بخاطر فاتر آمد کہ تذکرہ مرقوم سازد...۱"

گردیزی نے "اخوان زمان" کے باقی تذکرے دیکھے ہوں یا نہ دیکھے ہوں، یہ بہرحال یقینی ہے کہ میر کا تذکرہ ان کی نظر سے ضرور گزرا۔ اسے اخلاقی جرأت کی کمی کہئے یا محض رعایت مصلحت کہ انہوں نے میر کا نام نہیں

۱؎ تذکرہ گردیزی ص ۳

لیا۔ ورنہ یہ بات قریب بہ یقین ہے کہ گردیزی کی مندرجہ بالا تعریف نکات ہی کے خلاف ہے۔

افسوس ہے کہ گردیزی نے تذکرہ میر پر اعتراضات کرتے وقت اپنی تصنیف کے متعلق جو دعوے کئے ہیں ان کو پورا نہیں کیا بلکہ باہم مقابلہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے عموماً نکات الشعرا کو سامنے رکھ کر (بہ ادنیٰ تصرف) ان کی اصل عبارتیں نقل کر لی ھیں مثلاً ریختہ کی اقسام[1] اور اس کی تعریف کے موضوع کو لیجئے۔ اس میں میر اور گردیزی دونوں کی عبارتیں ایک ہیں ان دونوں تذکروں میں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ میر صاحب نے ۱۰۲ شعراء کے حالات لکھے ہیں۔ مگر گردیزی نے صرف ۹۸ شعراء کا ذکر کیا ہے۔ تعجب ہے کہ میر کے اختصار کا گلہ مند گردیزی ان میں سے ۸۴ شعراء کے حال میں ہر شاعر کے لئے ایک آدھ سطر سے زیادہ جگہ نہیں نکال سکا۔ کلام پر رائے بھی معمولی ہے اور بقول مولانا عبدالحق کہیں بھی:

"جودتِ طبع کا ثبوت نہیں دیا"

میر پر ان کا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے کام کے شعرا کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن خود یہ کیا ہے کہ ۲۹ ایسے شعرا نظر انداز کر دیئے ہیں جو میر کے یہاں

---

[1] تینوں تذکروں کے اس حصے کی اصل عبارت مخزن نکات کے بیان میں نقل کی جائے گی۔

موجود ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے ایک آدھ موقع پر میر صاحب کی نسبت حالات مفصل تر دیئے ہیں[۱]۔ بعض شعرا کے حالات اور بعض شعرا کے کلام کا انتخاب بھی زیادہ دیا ہے۔ مگر دکنی شعرا کے حالات میں بالکل اضافہ نہیں کیا اور تنقید تو کہیں ہے ہی نہیں۔ ہاں یہ کمال ضرور دکھایا ہے کہ میر صاحب کے بیانات کی تردید کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مثلاً خاکسار، حشمت، یقین، سجاد وغیرہ کی انتقاماً بہت تعریف کی ہے۔ خود میر صاحب کا حال تین سطروں پر مشتمل ہے۔ حالانکہ انصافاً میر اس سے زیادہ توجہ اور سلوک کے مستحق تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ میر کے اشعار کا انتخاب ایک شعر تک محدود ہے لیکن محسن کے جو میر تقی میر کے کلام کے سارق خیال کئے جاتے ہیں۔ دس پندرہ اشعار پیش کئے گئے ہیں۔

خلاصہ: یہ ہے کہ اس تذکرے کا وجود میر کے مخالف گروہ کے احتجاج کا مظہر ہے ورنہ تذکرے کی حیثیت سے اس کا کوئی درجہ نہیں۔ اس کا سارا اسلوب، اس کی عبارتیں، اس کے استعارے اور اشارے سب کے سب میر کی نقل ہیں۔ اردو کے اولین تذکروں میں سے ہونے نیز تذکرہ میر کا جواب ہونے کی وجہ سے اس کو اس سرسری مضمون میں جگہ دے دی گئی ہے ورنہ شاید اس کو اس مقالے میں جگہ بھی نہ دی

۱۔ مثلاً بہار کا حال ص۔۲۱

جاتی تھی[۱]

مخزن نکات "دبستان میر" کا یہ دوسرا تذکرہ ہے جو ۱۱۶۸ھ میں مرتب ہوا۔ اس کے مصنف شیخ قیام الدین قائم چاندپوری (متوفی ۱۲۰۸ھ) ہیں۔ تعجب ہے کہ قائم بھی تذکرہ میر کے وجود سے بے خبری کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے تذکرہ کو اردو کا پہلا تذکرہ کہتے ہیں[۲]۔ حالاں کہ اس پر نکات الشعرا کے اثرات کا پرتو صاف صاف دکھائی دیتا ہے ریختہ کی تعریف اور اس کی ابتدا کے جو حالات دیے ہیں وہ میر کے بیانات سے ملتے جلتے ہیں[۳]۔ ان مماثلتوں کو دیکھ کر یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ قائم نے میر کے تذکرے سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ مخزن نکات میں قائم کے سمیت ۱۱۴ شعرا کا حال ہے مگر جو حالات دیئے ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو نکات الشعرا میں ہیں۔ انتخاب کلام بھی عام حالات میں یکساں ہے۔ لیکن گردیزی کے برعکس اتنی بات ضرور ہے کہ قائم نے میر کی مخالفت کو اپنا صریح نصب العین قرار نہیں دیا بلکہ اعتدال اور

---

[۱] یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔ شروع میں مولانا عبدالحق کا مبسوط دیباچہ ہے۔

[۲] دیباچہ از مولانا عبدالحق ص۔ ہ۔

[۳] نکات الشعرا ص ۱۸۶ / ۱۸۷ (اقسام ریختہ) کا مخزن نکات ص ۲۴ سے مقابلہ کیجیے۔

نوادر کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ قائم خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ چنانچہ بعض لوگ ان کو سودا پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے تذکرے میں حسن ذوق کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔

قائم کے تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی دفعہ اردو شاعری کے ادوار مقرر کئے گئے ہیں۔ اگرچہ تذکرہ نکات الشعرا میں بھی کچھ نیم تاریخی سی ترتیب موجود ہے مگر قائم نے اس معاملے میں قدرے اصول بندی سے کام لیا ہے اور ہر دور کے شروع میں اس دور کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں[۱]۔ تذکرہ نگاری میں یہ تاریخی احساس "لٹریری ہسٹری" کی طرف رجحان کا پہلا قدم ہے جو آگے چل کر آب حیات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

قائم اگرچہ دکن کی شاعری کے کچھ زیادہ مداح نہیں[۲]۔ پھر بھی انہوں نے شعرائے دکن کے حالات کی فراہمی میں خاص اہتمام کیا ہے مگر قائم سے بعض ایسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے

۱؎ سید محمد صاحب ایم۔ اے نے گلشن گفتار کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ "پروفیسر آزاد نے اسی کتاب کے نوٹوں کو پھیلا کر اپنی عبارت آرائی کی ہے۔" (ص ۱۴) اس بیان کو اگر صحیح بھی سمجھ لیا جائے تو بھی مبالغے سے خالی نہیں

۲؎ قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

مثلاً انہوں نے سعدی شیرازی کو ریختہ کا شاعر قرار دیا ہے۔ حالاں کہ یہ بالکل غلط ہے۔

اگرچہ میر اور قائم کے تذکروں میں مواد کے لحاظ سے بہت زیادہ فرق نہیں تاہم سیرت کی خاکہ کشی میں میر کو جو ید طولیٰ حاصل ہے وہ قائم کو نصیب نہیں۔ میر خاکہ بناتے وقت مناسب الفاظ پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ نہایت جامع اور پرمعنی ہوتے ہیں۔ لیکن قائم صرف چند القاب و آداب تک محدود رہتے ہیں جن میں بے مقصد توصیف ہوتی ہے یا محض لفاظی البتہ بعض موقعوں پر میر صاحب کے بعض خاص الفاظ، یار باش، گرم اختلاط، ہنگامہ گرم کن وغیرہ بھی ان کے تذکرے میں آگئے ہیں۔ جسے میر تقی میر کا فیض سمجھنا چاہیئے۔

تذکرہ میر حسن میر حسن دہلوی مصنف سحر البیان کا تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھا جاتا ہے[۱] اردو شاعری کا تیسرا دور ختم ہو رہا ہے اور دور چہارم کے نامور مسند شہرت پر فائز ہو رہے ہیں اس لئے اس تذکرے کی اہمیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں تیسرے اور چوتھے دور کی شاعری کے متعلق ہم عصرانہ معلومات جمع ہیں۔

---

[۱] دیباچہ از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ص ۲

اس کے علاوہ میر حسن اعتدال اور میانہ روی کی صفت سے متصف ہیں۔ انتخاب کلام کے معاملے میں بھی پاکیزگی ذوق کا ثبوت دیا ہے۔

اصولاً یہ تذکرہ بھی دبستان میرؔ سے متعلق ہے۔ لیکن اعلاناً میر حسن نے قائم کے تذکرے کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس میں بھی شعرا (متقدمین، متوسطین اور متاخرین) کے تین دور قرار دیئے ہیں۔ قائم کے تذکرے میں اور اس میں فرق صرف اس قدر ہے کہ میر حسن نے بغرض سہولت داخلی طور پر ہجی ترتیب مد نظر رکھی ہے۔ (۔ تا جویا سا تردد نہ افتد[۵])

مگر میر کی طرح قائم نے بھی اس کا خیال نہیں کیا۔

سیرت کی خاکہ کشی میں میر حسن بھی میر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے حقیقی اوصاف بیان کرنے کی بجائے مبالغہ و سخن طرازی سے کام لیا ہے البتہ وہ شعرا کے شاعرانہ رتبے کی تعیین میں اکثر صائب الرائے ثابت ہوتے ہیں اور اُردو شاعری کی بعض اہم مخزاعات میں ادبی گروہ بندیوں سے الگ ہو کر عموماً جچی تلی رائے دیتے ہیں۔ مثلاً میر اور سودا کا تقابلی رتبہ یہ ایسا موضوع ہے جس کے متعلق عموماً بڑی افراط تفریط سے کام لیا جاتا ہے مگر میر حسن ہر قسم کے تعصبات سے بلند رہتے ہیں اور ان دو بڑے

---

[۵] تذکرہ میر حسن ص ۔۴

شاعروں کی شاعرانہ حیثیت کے متعلق وہی بات لکھتے ہیں جو حقیقت کے مطابق ہے یعنی ان کے نزدیک میر غزل کے امام اور سودا ہجو اور قصیدے کے بادشاہ ہیں اسی طرح میر نے خاکسار کے متعلق جو کچھ کہا ہے میر حسن اس سے اتفاق نہیں رکھتے یا مثلاً یقین کی شاعری کے متعلق میر تقی کا خیال یہ تھا کہ وہ ذوق شعر سے معرا تھے۔ بعض دوسرے تذکرہ نگار میر کے اس خیال سے (غالباً جانب داری کی وجہ سے) متفق نہیں مگر میر حسن اس معاملے میں میر کے ہم نوا ہیں۔ یقین کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ہر چند مبالغہ کردیم، ایک مصرع موزوں نکرد۔ ذائقہ سخن فہمی ہم نداشت"[۱]

ان اوصاف کے ساتھ تذکرہ میر حسن میں خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً بعض اوقات واقعات کی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ چنانچہ قائم کے تتبع میں سعدی دکنی کو سعدی شیرازی سمجھتے ہیں۔ وہ اس دور کے عام تذکروں کی طرح سنین کی تعیین سے بھی غافل ہیں۔

تذکرہ ہندی مصحفی

مصحفی کا تذکرہ ہندی بھی دلبستان میر سے متعلق ہے۔ اس میں عہد محمد شاہ سے لے کر شاہ عالم ثانی کے زمانے تک کے شعرا کے حالات ہیں اس کا سن تصنیف

---

[۱] تذکرہ میر حسن ص ۲۱۹۔

۱۲۰۹ھ ہے[۱]۔ تعجب ہے کہ اس تذکرے میں مصحفی نے تذکرہ میر کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ انہوں نے گردیزی، میر حسن اور حکیم قدرت اللہ قاسم کے تذکروں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ مصحفی کا بیان ہے کہ انہوں نے اس تصنیف میں صرف معاصرین کے حالات پر خاص توجہ دی ہے ہاں تیمناً و تبرکاً قدما کا بھی ذکر کیا ہے۔ مصحفی کے تذکروں کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ تکلف اور عبارت آرائی سے کام نہیں لیا وہ بے جا طول سے پرہیز کرتے ہیں۔ شعراء کے متعلق جو رائیں ظاہر کی ہیں ان میں تنقیدی عنصر گو کم ہے مگر اکابر شعرا کے متعلق ان کی آرا وقعت کے قابل ہیں[۲]۔ اور انصاف یہ ہے کہ ان کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے سچ سچ لکھا ہے اور ذاتی اختلافات کو اثر انداز ہونے[۳] کا موقعہ نہیں دیا۔

ریاض الفصحا مصحفی کا دوسرا تذکرہ ہندی گویان جو ریاض الفصحا کے نام سے موسوم ہے ۱۲۲۱ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۳۶ھ[۴] میں ختم ہوا اس کی حیثیت تذکرہ ہندی کے تکملہ کی ہے۔ ان دونوں تذکروں میں کہیں کہیں اختلاف پایا

۱؎ دیباچہ از مولانا عبدالحق ... ز۔

۲؎ دیباچہ " " ... ی۔

۳؎ " " " ... م۔

جاتا ہے مگر بہ قول مولانا عبدالحق

یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ ایک عالم شباب کا نتیجہ ہے اور دوسرا زمانہ شیب کا۔[1]

مصحفی کے تذکروں میں بہ لحاظ فن کوئی خاص اہم بات موجود نہیں ان کی ترتیب نہجی ہے اور انتخاب کئے ہوئے اشعار کی تعداد خاصی ہوتی ہے۔ شعرا کے حالات میں بھی قدرے تفصیل نظر آتی ہے اور تاریخوں اور سنوں کی تعیین کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اظہار رائے میں ان کا لب و لہجہ نرم اور معتدل ہوتا ہے۔[2]

---

[1] دیباچہ از مولانا عبدالحق ۔۔ م۔

[2] معارف اگست ۱۹۲۳ میں مولانا عبدالسلام نے ایک مضمون اس تذکرے کے متعلق لکھا تھا۔

دبستانِ میر کے خلاف ردِ عمل

جامعیت کی کوشش

عیارالشعرا سے گلشن بے خار تک

تذکروں کے پہلے سلسلے کی ایک خصوصیت اختصار و ایجاز تھی لیکن اس اختصار کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حالات مختصر اور ناکافی ہوتے تھے اسی طرح بہت سے شاعر نظر انداز ہو جاتے تھے اس وجہ سے معاصرین کو بددل اور ناراض ہونے کا موقعہ مل جاتا تھا جو شعرا "تذکرے" سے رہ جاتے تھے ان کو شکایت ہوتی تھی بنا بریں شعرا کی کثرت اور شاعری کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے ایسی تالیفات کی ضرورت محسوس ہونے لگی جو تمام شاعروں کے حالات پر حاوی ہوں اس تفصیل اور جامعیت کی کوشش کا سب سے بڑا مظہر خوب چند ذکا کا تذکرہ عیارالشعرا ہے جو ۱۲۰۸ھ میں شروع ہوا اور مصنف ۱۲۴۷ھ تک اس میں اضافے کرتا رہا

(سپرنگر[1] کے بیان کے مطابق مصنف کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ہوا) شعرائے اردو کا یہ جامع لغت ۳۰ سال تک جمع ہو کر مرتب ہوتا رہا اس میں ۵۰۰ شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے ہیں لیکن بقول سپرنگر

"اس میں تنقید کا نام نہیں اور تکررات و اغلاط سے پُر ہے"[2]

جامعیت کی یہ کوشش بجائے خود بے کار اور غیر مفید سہی لیکن اس کا ایک مفید پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعہ شعرائے اردو کے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع ہو گئی ہیں اور اگر ان تالیفات کے عمدہ انتخاب مرتب کر دیے جائیں تو ان سے کئی مفید کام لیے جا سکتے ہیں۔ میر محمد خاں سرور کا تذکرہ عمدہ منتخبہ بھی اسی قسم کا مجموعہ ہے۔ یہ دراصل عیار الشعرا کی تلخیص ہے مگر بعض خصوصیات کی بنا پر یہ اپنی اصل سے بہتر تالیف بن گئی ہے عمدہ منتخبہ کے سال تالیف میں اختلاف ہے۔ قیاساً ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۴۲ھ کے درمیان مرتب ہوا ہو گا[3]۔ اس میں (بقول سپرنگر) ۱۲۰۰ شعرا کے حالات ہیں اور ترتیب بہ اعتبار

---

1. سپرنگر - ص ۱۸۴
2. دتاسی کے خطبات - ص ۹۱
3. خطبات دتاسی - ص ۸۸

حروف ہتجی ہے۔ نمونہ کلام بھی دیتا ہے۔ سپرنگر کا بیان ہے کہ

"یہ عیار الشعرا کا بہتر چربہ ہے"[1]

مجموعۂ نغز ۱۲۲۱ھ اس کے بعد ان دو تذکروں کے بکھرے ہوئے مواد سے ایک اور تذکرہ لکھا جاتا ہے جو یقیناً اول درجے کے تذکروں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ یعنی مجموعہ نغز از قدرت اللہ قادری المتخلص بہ قاسم (متوفی ۱۲۴۶ھ) اس تذکرے کا سال تصنیف ۱۲۲۱ھ ہے سپرنگر کا بیان ہے۔

"کہ مجموعہ نغز بہت حد تک عمدہ منتخبہ سے ماخوذ ہے"

اس میں ۶۰۰ شعراء کے حالات ہیں[2]۔

حکیم قدرت اللہ قاسم نے عیار الشعرا اور عمدہ منتخبہ سے کس حد تک استفادہ کیا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے (کیوں کہ میں خود اس تذکرے کو نہیں دیکھ سکا) لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ

"تذکرہ ہذا میں خود مصنف کی تحقیقات اور تلاش کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے"[3]

۱۔ سپرنگر ص ۱۸۵ اور ۱۸۶

۲۔ دیباچہ مجموعہ نغز از پروفیسر شیرانی سپرنگر (صفحہ ۱۸۶) نے ۸۰۰ شعرا بتائے ہیں۔

۳۔ " " ایضاً

سپرنگر نے اپنی فہرست میں ۳۲۰ شعرا کے سلسلے میں اس کو بطور ماخذ اصلی ؎ کے استعمال کیا ہے۔ دتاسی نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور آب حیات آزاد کا ایک بڑا حصہ تو اسی تذکرے کا مرہون منت ہے۔

مجموعہ نغز، دلبستان میر کے تذکروں کے مقابلے میں ایک مبسوط اور ضخیم تالیف ہے گو کہ یہ عیار الشعرا سے ماخوذ ہے مگر اس کی تفاصیل عیار الشعرا سے زیادہ مستند ہیں اور ترتیب بھی اس سے بہتر ہے اس میں عہد محمد شاہ سے لے کر عہد شاہ عالم ثانی تک کے شعرا شامل ہیں اور مصنف کو دور سوم اور دور چہارم کے شعرا سے ذاتی واقفیت حاصل ہے اور جیسا کہ دتاسی؎ نے لکھا ہے۔

"اس تصنیف میں قصے لطیفے اور انتخابات اس سلیقے سے دیئے ہیں کہ دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔"

آزاد کی اکثر حکایتیں مجموعہ نغز ہی سے لی گئی ہیں۔

اس تذکرے میں حالات مفصل اور انتخاب بہ کثرت ہے لیکن افسوس ہے کہ ضبط سنین کی کوشش نہیں کی گئی اور تنقید بھی کچھ زیادہ

۱؎ دیباچہ مجموعہ نغز از پروفیسر شیرانی سپرنگر (صفحہ ۱۸۶) نے ۸۰۰ شعرا بتائے ہیں۔

۲؎ خطبات دتاسی ص ۸۵۔

نہیں۔

پروفیسر شیرانی نے صحیح لکھا ہے کہ

"تقریباً ہر شخص کو نیکی کے ساتھ یاد کیا ہے" اور کہا ہے کہ یہ امراں کی نیک دلی اور سلیم الطبعی کی دلیل ہے۔[1]

لیکن تعجب یہ ہے کہ اس نیک دلی اور سلیم الطبعی کے باوجود انہوں نے میر تقی میر پر بہت سے افترا باندھے ہیں۔ چنانچہ اس تذکرے کے تتبع ہیں۔

"آب حیات میں میر صاحب کی سیرت کی جو بدنما تصویر اتاری گئی ہے اس کے بعض رنگ حکیم صاحب ہی کے تیار کردہ ہیں۔"

اس کے برعکس انشاء کی سیرت کے کمزور پہلوؤں کو بھی اچھی طرح نمایاں نہیں کیا۔[2] ممکن ہے کہ معاصرانہ رور رعایت مدنظر ہو۔ اس تذکرے کو ایک لحاظ سے نکات الشعرا کی ضد کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اختصار کے مقابلے میں تفصیل اس کا نصب العین ہے۔ نکات میں نمونہ کلام کے طور پر جہاں غزل کا صرف ایک شعر ہے وہاں مجموعہ نغز

---

[1] دیباچہ مجموعہ نغز

[2] " " "

[3] " " ادب

میں تین تین چار چار شعر بلکہ پوری پوری غزلیں لکھ دی گئی ہیں اس تذکرے میں بھی میر کی اٹھائی ہوئی ادبی نزاعیں زیرِ بحث ہیں۔ انعام اللہ خاں یقین کے متعلق میر نے جو کچھ لکھا ہے اس کی سخت تردید کی ہے شاعری میں مرزا سودا کو میر پر ترجیح دی ہے۔

"مرزا دریائے است بیکراں و میر نہرے است
عظیم الشان در معلومات قواعد فن میر را بر میرزا برتری
است در قوت شاعری میرزا را بر میر سروری[1]"

الفاظ کی ملمع سازی کے باوجود حکیم صاحب کی رائے ظاہر ہے! اس کے مقابلے میں مصحفی اور میر حسن کی آسا زیور اعتدال و انصاف سے بڑی حد تک آراستہ ہیں۔

اس تذکرے کی ترتیب بہ اعتبار حروف تہجی ہے اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ہم نام شعرا کے حالات بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

تذکرے میں حکایات اور لطائف شامل کرنے سے دلچسپی میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ اس کو یقیناً اردو کے اول درجے کے تذکروں میں ممتاز جگہ دی جاسکتی ہے۔

---

[1] مجموعہ نغز ج ۲ - ص ۲۴۱

گلشن بے خار
۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ گلشن بے خار ہے جو ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء میں شروع ہو کر ۱۲۵۰ / ۱۸۳۴-۳۵ء میں مکمل ہوتا ہے۔ مجموعہ نغز سے بھی بہتر اور اغلاط سے عموماً پاک ہے۔ شیفتہ نے جو آخری دور کے بہترین نقادان فن میں شمار ہوتے ہیں ۲۶ سال کی عمر میں اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا دلی میں شیفتہ کے مکان پر ۱۸۴۷ء تک مشاعرے کی مجلسیں منعقد ہوتی رہیں ان میں اس عہد کے بہترین ادیب اور صاحبان ذوق شامل ہوتے تھے ان مواقع کی بناء پر شیفتہ کو نہ صرف اپنی ادبی اور فنی صلاحیتوں کو ابھارنے اور آزمانے کا موقع ملا بلکہ ان کو اپنے تذکرے کے لئے عمدہ مواد جمع کرنے کی سہولت بھی مہیا ہو گئی۔

سپرنگر کا بیان ہے کہ یہ تذکرہ بہت حد تک مجموعہ نغز سے ماخوذ ہے[۱] لیکن صحت اور اعتدال رائے کے علاوہ عمدگی انتخاب کے اعتبار سے بھی۔

"اپنے وقت کی جتنی کتابیں ہیں ان سب میں یہ سب سے زیادہ صحیح ہے"[۲]

اس میں ۸۰۰ شعرا کے حالات ہیں[۳]۔ جن کے کلام کا بہترین نمونہ

۱۔ سپرنگر ص ۱۸۹
۲۔ دتاسی کے خطبات ص ۹۲
۳۔ بانکی پور فہرست مخطوطات ج ۸۔ عدد ۷۱۸، ص ۱۵۸

دیا گیا ہے۔ مصنف خم خانہ جاوید[۱] نے بھی گلستان سخن اور گلشن بے خار[۲] کو اس وجہ سے پسند کیا ہے کہ یہ

"ارکان تذکرہ نویسی سے مالا مال اور محققانہ پابندی سے اپنے مذوّنوں کا کمال دکھا رہے ہیں۔"

گلستان بے خزاں باطن

گلشن بے خار کے ضمن میں گلستان بے خزاں کا سرسری سا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے مصنف قطب الدین باطن کا شیفتہ کے تذکرے پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں صرف شعرائے دہلی کو بلند مقام دیا گیا ہے اور دوسری جگہوں کے اکابر شعرا کو نظر انداز کر دیا ہے اسی وجہ سے باطن نے گلستان بے خزاں میں نظیر اکبر آبادی کو خاص درجہ دیا ہے اور شیفتہ کو ان کی "دہلی نوازی" کے لئے مطعون کیا ہے اس خاص معاملے میں یہ تسلیم کر لینے کے باوجود کہ شیفتہ عموماً شعرائے دہلی کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھتے ہیں، ہم باطن کے خیال سے کاملاً متفق نہیں ہو سکتے اس لئے کہ خالص ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے شیفتہ کی رائے عموماً درست ہوتی ہے اگرچہ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا

---

[۱] خم خانہ ج ۱ - ص ۲

[۲] سنہ ۱۸۷۵ء میں دہلی میں طبع ہوا تھا

کہ ان کی سب سے بڑی کوتاہی ان کی "اشرافی ذہنیت" اور ان کی "اسلوب پرستی" ہے جس کی بنا پر بچارے نظیر شاعروں کی صف اولین میں بیٹھنے کے حق دار نہ سمجھے گئے۔ یہ ان کی دہلی نوازی نہیں، اشراف پرستی ہے جس کو عوامی شاعری اور عوامی الفاظ اس حد تک ناگوار ہیں کہ اس کے نزدیک یہ شاعری کی دنیا کی چیز ہی نہیں۔ حق یہ ہے کہ باطن کا نشانہ غلط تھا اور اگر باطن کا احتجاج اصولاً درست بھی مان لیا جائے تب بھی اس کا طریق اظہار غلط اور اس کا بنیادی استدلال غیر مؤثر ہے بلکہ بعض اعتبارات سے یہ "اسی مرض" کی علالت ہے جس کا مریض وہ شیفتہ کو قرار دیتے ہیں۔

بہر حال شیفتہ کے تذکرے کے ساتھ باطن کے تذکرے کا ذکر ناگزیر سا ہے۔ دونوں تذکرے ایک ادبی گروہ بندی کے لئے نزاعی مواد بہم پہنچاتے ہیں ان کی حمایت یا مخالفت میں بہت سے رسالے لکھے گئے۔ مگر یہ نزاع ادبی نہیں۔ اس کشمکش کی تہ میں وطنی تعصب کارفرما ہے۔ بے خزاں تذکرے کی حیثیت سے ایک معمولی کتاب ہے اور بے خار کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں اس کے علاوہ اسلوب میں بھی کوئی خاص ندرت نہیں (البتہ) اس سے اس عہد کی ادبی نزاعوں پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔ ورنہ اس کی افادیت اور قدر و قیمت بقول سپرنگر[۱] صرف اسی قدر

---

[۱] سپرنگر ص ۱۸۹

"This may be considered a translation of the preceding Tazkirah (Gulshan-e-Bekhar) into unintelligible Hindustani with some idiotical remark"

طبقۂ ثانی

جدید اثرات

ادھر دلی میں قدیم طرز تذکرہ نگاری اپنے عروج پر تھی اور اہل کمال میر اور قائم کے اسلوب کی پیروی کر رہے تھے ادھر کلکتے میں ادب کے جدید رجحانات کا آغاز ہو رہا تھا۔ کلکتہ ایک عرصے سے انگریزوں کے زیر نگیں تھا جہاں مغربی خیالات اور مغربی نظریئے آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے اور ادب اور فن کے قواعد و اصول ایک نئے سانچے میں ڈھل رہے تھے اگرچہ قدیم روایات کے خلاف کھلی بغاوت نہیں ہوئی مگر مصنفین کا ترقی پسند (یا تغیر پسند) گروہ اپنے ذہن و فکر کو ان کے قبول کرنے کے لئے آمادہ کر رہا تھا۔ چنانچہ باقی شعبہ ہائے ادب کی طرح تذکرہ نویسی بھی (جس کی خصوصیات کا ذکر گزشتہ اوراق میں آچکا ہے) نئے حالات سے اثر پذیر ہوئی جس کے ماتحت تذکرہ نگاری کے بعض نئے طریقے ظہور میں آئے اور پرانے تذکروں کے طریق تدوین میں بعض اصلاحیں عمل میں آئیں۔ قدیم تذکروں کا ایک بڑا عیب یہ تھا کہ ان میں سنین واقعات کی تعیین نہیں ہوتی تھی اور اشخاص

کے واقعات زندگی کی تحقیق بھی مکمل نہ ہوتی تھی کبھی کبھی مصنف کسی گروہ یا جتھے کی طرف داری یا مخالفت میں اتنا جھک جاتے تھے کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ نئے تذکروں میں ان نقائص کی اصلاح کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ یہ تذکرے ارتقا کی تین منزلوں سے گزرتے نظر آتے ہیں۔

پہلی منزل سب سے پہلی منزل میں تذکرہ نگاری میں تحقیقی اور تاریخی رجحان کی خاص ترقی ہمیں متوجہ کرتی ہے۔

دوسری منزل دوسری منزل میں زبان اردو کی لسانیاتی تحقیق اور مختلف ادوار میں مختلف اصناف سخن کی ترقی کے اسباب اور فن تذکرہ نویسی کی تنقید وغیرہ پر زور دیا گیا ہے۔

تیسری منزل اور تیسری یا آخری منزل میں تذکرہ نویسی کو ادبی تاریخ کے قالب میں ڈھالنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔

ان نئے رجحانات کی ترتیب مختلف مراکز میں ہوئی۔ شروع شروع میں غیر معین جدید خیالات اور نظریات پھیلتے رہے یہ نئے مذاق کی تحریریں پڑھنے یا انگریز علماء و فضلا سے میل جول کا نتیجہ تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں نئے رجحانات کو ترقی ہوئی۔ دہلی کالج کے اساتذہ اور دوسرے فضلائے مغرب کے براہ راست اثر سے نئے

طریقے اور نئے خیالات اور بھی پھیلے جن سے دوسرے تمام شعبہ ہائے ادب وفن کی طرح تذکرہ نویسی بھی متاثر ہوئی۔

(i) ان نئے تذکروں میں گلزار ابراہیم اور گلشن ہند پہلی منزل سے متعلق ہیں۔

(ii) دتاسی، کریم الدین اور صہبائی کے تذکرے دوسری منزل کے نمائندے ہیں۔

(iii) اور آب حیات آزاد تیسری منزل کے رجحانات کی آئینہ دار ہے

گلزار ابراہیم
۱۱۹۸ھ ۱۷۸۴ء

ابراہیم خاں (متوفی ۱۲۰۸ھ) پٹنہ کے رہنے والے، وارن ہیسٹنگز کے دوست اور لارڈ کارنوالس کے زمانے میں بنارس کے چیف مجسٹریٹ تھے۔ انھوں نے ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں فارسی میں گلزار ابراہیم کے نام سے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا اس کے علاوہ انھوں نے شعرائے فارسی کے دو تذکرے تحفۂ ابراہیم اور خلاصۃ الکلام اور ایک دو تاریخی کتابیں بھی لکھیں[1]۔

یہ تذکرہ ۳۶۰ شعراء کے حالات پر مشتمل ہے[2] جیسا کہ سپرنگر نے

---

[1] دیباچہ گلشن ہند از مولانا عبدالحق و سپرنگر ص ۱۸۰

[2] سپرنگر اور دتاسی نے ۳۰۰ لکھا ہے۔

لکھا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ شعرا کے حالات زندگی اور وفات کی تاریخوں کی تعیین۔

۲۔ خط وکتابت کے ذریعے واقعات زندگی کی فراہمی۔

۳۔ معاصرین کے حالات میں ان کے خطوط کے اقتباسات۔

۴۔ کلام کے نمونے مفصل دیے ہیں۔

گلزار ابراہیم کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں شعراء کے حالات نسبتاً مفصل ہیں۔ انہوں نے ان کی زندگی کے پرائیویٹ پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور نجی واقعات بھی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین زور[1] نے صحیح لکھا ہے کہ علی ابراہیم کو منصب کے لحاظ سے وہ ذرائع حاصل تھے جن کی بدولت شعرائے معاصر کے حالات کی فراہمی بہ احسن طریق ہو سکتی تھی اس کے علاوہ ضمنی طور پر اس عہد کے تاریخی حالات و واقعات بھی لائے گئے ہیں۔ شعرا کے حالات کے ضمن میں اردو شاعری کی مختلف اصناف پر تنقیدی بحث بھی کی گئی ہے۔ تعجب ہے کہ ابراہیم نے اپنی اس تالیف میں قدیم تذکروں کا ذکر نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے کسی

---

[1] مقدمہ گلزار ابراہیم (د گلشن ہند) از ڈاکٹر محی الدین قادری زور ص ۲۴

"خاص دبستان کی وکالت یا مخالفت بھی نہیں کی"
مگر پرانے تذکروں سے استفادہ کا انکار یا ان کا عدم اعتراف بہت حد تک باعث تعجب ہے۔ اس تذکرے کی ترتیب عام تذکروں کی طرح بہ اعتبار حروف تہجی ہے۔ مصنف نے قائم اور میر حسن کے قائم کردہ ادوار کی پابندی نہیں کی۔

ابراہیم کے اس تذکرے میں قدیم اور جدید اسلوب تدوین کا اجتماع نظر آتا ہے اور مختلف خصوصیات کے پیش نظر یہ اردو کے بہترین تذکروں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ علی الخصوص شعرا کی تاریخ وفات کی تعیین کے معاملے میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔

گلشن ہند (۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء) یہ تذکرہ جو ۱۲۱۵ھ میں گلکرائسٹ کی تحریک اور فرمائش سے لکھا (۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء) گیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے آثار ادبیہ میں سے ہے۔ علی لطف نے جن کے مفصل حالات زندگی دستیاب نہیں ہوسکے۔ گلزار ابراہیم سے اردو میں ترجمہ کیا لیکن ۳۲۰ شعرا میں سے صرف ۶۸ منتخب افراد کا حال لیا ہے اور جابجا (۳۰، ۳۲ افراد کے بارے میں) اضافے کیے ہیں۔ تعجب ہے کہ انہوں نے آبرو۔ اثر۔ بیدار۔ حاتم سوز اور فغاں کے متعلق گلزار ابراہیم کی معلومات پر کچھ اضافہ نہیں کیا۔ حالاں کہ ان کے لئے یہ اضافہ بالکل ممکن تھا۔ تاہم اس میں بعض ایسی معلومات جمع ہوگئی ہیں جو اور کہیں نہیں ملتیں۔ مثلاً

(الف) میر تقی میر کا فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ملازمت کے لئے بلایا جانا مگر بہ وجہ پیری کا نہ لیا جانا۔

(ب) میر تقی میر کا آصف الدولہ سے بگاڑ وغیرہ۔

اس تذکرہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں تاریخی حالات قدرے مفصل ہیں مثلاً

(الف) شاہ عالم۔ تانا شاہ آصف الدولہ۔ امیدا سید حسین علی اور ان کے بھائی کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔

علی لطف نے ترجمے کی پابندیوں کے باوصف کہیں کہیں تصرفات بھی کئے ہیں جن میں اس کے ذاتی معتقدات کی جھلک نظر آتی ہے۔

علی لطف کا یہ تذکرہ گلزار ابراہیم کی ایک اصلاح یافتہ شکل ہے عام اسلوب، تالیف ترتیب اور بنیادی رجحان کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔[1]

دتاسی کا بیان ہے کہ یہ شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے جس کی

---

[1] گلشن ہند ۱۹۰۶ء میں چھپا۔ بعد میں انجمن ترقی اردو نے ۱۹۳۴ء میں گلزار ابراہیم کے ساتھ ملا کر اس کو شائع کیا۔ جس پر ڈاکٹر زور نے مقدمہ لکھا ہے۔ نیز سپرنگر ص ۱۸۴ء خطبات دتاسی صفحہ ۸۳

زبان اردو ہے۔ اس تذکرے کے خلاف ایک اعتراض یہ ہے کہ یہ دہلی والوں کا جانب دار ہے اور دبستان میر کا حامی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے تو ہم کو ماننا چاہیئے کہ مصنف نے اپنے معتقدات کو چھپانے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے اور اس کی جانب داری بہت کم نمایاں ہوئی ہے۔

صہبائیؔ کے تذکرے

فورٹ ولیم کالج کے بعد آگرہ کالج اور دہلی کالج کے ماحول میں بعض نئے رجحانات کی نشوونما ہوتی ہے۔ شیخ امام بخش صہبائی جو اس زمانے میں ادبیات فارسی کے امام مانے جاتے تھے دہلی کالج میں فارسی کی تعلیم پر مامور تھے۔

سپرنگر جب اپنی فہرست کو ترتیب دے رہا تھا اس وقت ان کی عمر ۶۰ سال کی تھی[1]

انہوں نے ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں ایک انتخاب ولی، درد سودا، میر۔ جرأت۔ حسن۔ نصیر۔ ممنون۔ ناسخ، مول چند، ذوق اور مومن کے کلام کا تیار کیا تھا۔ جس کا نام "خلاصہ" (یا انتخاب دواوین شعرائے مشہور زمان اردو کا" تھا۔ یہ ۱۸۴۴ یا ۱۸۴۶ء میں چھپا تھا[2] ہرچند کہ اس کو خلاصہ یا انتخاب کہا گیا ہے مگر یہ انتخاب

---

[1] سپرنگر ص ۱۹۰

[2] دتاسی کے خطبات ص ۹۴۔

[3] بانکی پور فہرست۔

سے کچھ زیادہ ہے کیوں کہ ہر شاعر کے کلام کے ساتھ اس کے کچھ حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔

اس تذکرے کے متعلق ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں اردو شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ جس میں جدید رنگ جھلک رہا ہے۔

گلستان سخن صابر
۱۲۷۰ھ - ۱۲۷۱ھ

اسی زمانے میں ایک اور تذکرہ منظر عام پر آیا یعنی گلستان سخن جو مرزا قادر بخش صابر اور صہبائی کی مشترک تصنیف بتائی جاتی ہے اگرچہ بقول بعض صرف صہبائی کا لکھا ہوا ہے یہ تذکرہ ۱۲۷۰ھ میں شروع ہو کر ۱۲۷۱ھ میں ختم ہوا اس کی ترتیب بہ اعتبار حروف تہجی ہے۔ اصل نام "آثار المعاصرین" ہے۔ گلستان سخن تاریخی نام ہے۔ خم خانہ جاوید میں اس تذکرے کے متعلق لکھا ہے کہ

"اس میں صابر نے صرف سرو قدان دہلی سے کام رکھا۔ باہر کے لہلہاتے ہوئے شمشادوں کو وہیں کھڑا رکھا"

لیکن یہ اعتراض صرف اس حد تک درست ہے کہ اس میں مصنف نے دہلی کے شعراء کی طرف خاص توجہ کی ہے جیسا کہ دیباچے

لہ خم خانہ جاوید ج ۱۔ دیباچہ ص ۲

میں اس کے اپنے اقرار سے ظاہر ہے۔ تذکرے کے شروع میں ایک تبصرہ ہے جس میں ایک مقدمہ اور تین مقاصد ہیں۔ ایک مقصد میں زبان اردو کی تحقیق اور اردو شاعری کی ترقی کے متعلق بحث ہے

☆☆☆

دتاسی اور کریم الدین کے تذکرے

تذکرہ گارساں دتاسی اردو ادب کے سلسلے میں گارساں دتاسی کے تین بڑے کارنامے ہیں۔

۱۔ کلیات ولی کی تصحیح اور اشاعت

۲۔ ہندوستانی ادب کی تاریخ

۳۔ خطبات (یا ہندوستانی ادب از ۱۸۵۰ تا ۱۸۷۷ء)

"ان کی ہندوستانی ادب کی تاریخ تین جلدوں میں ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ۳۰۰۰ ہندی اردو شعراء کا ذکر فرنچ زبان میں ہے دتاسی کی کوشش یہ تھی کہ ہندوستان کے تمام قابل ذکر شعراء کی ایک فہرست تیار کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تذکرے میں گمنام شعراء بھی شامل ہیں۔ دتاسی کہتا ہے۔

"میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ گو دو چار سطریں ہی کیوں نہ ہوں ان کا ذکر کر دینا ضرور ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بالکل گمنام رہ جائیں[۱]"

---

[۱] معارف اگست ۱۹۲۲ء

اس بارے میں دتاسی نے مشرقی رجحان سے کام لیا ہے۔ اسی طرح اس تذکرے کی ترتیب بھی مصنف کی خواہش کے خلاف بہ حروف تہجی ہے۔

دتاسی کے تذکرے میں واقعات کی غلطیاں خاصی ہیں لیکن اتنی ضخیم تصنیف میں غلطیوں کا نہ ہونا تعجب انگیز ہوتا۔ اسے دتاسی کا کارنامہ خیال کرنا چاہیئے کہ ہندوستان سے اس قدر دور ہونے کے باوجود وہ ہندوستانی زبانوں کے متعلق اتنی مستند معلومات جمع کر سکا ہمارے موجودہ موضوع کے اعتبار سے اس تذکرے کا بہترین اور اہم حصہ اس کا مقدمہ ہے جس میں اردو زبان کی تحقیق اس کا ہندی سے تعلق اردو۔ ہندی شاعری اور اس کی اقسام پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔

غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو تذکروں پر مجموعی اور تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور اگرچہ اس میں تذکروں کی فہرست جامع نہیں، تاہم مصنف نے حتی الامکان اس کو مکمل بنانے کی کوشش کی ہے تذکرے کے مقدمے میں جو کمی رہ گئی تھی وہ دتاسی نے اپنے پانچویں خطبے میں پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔

غرض اردوئے قدیم کی تحقیق اور تذکروں کی تنقید کی ابتدا دتاسی سے ہوئی جس کا ہماری تذکرہ نویسی پر گہرا اثر پڑا۔ اس کے بعد جو مستند تذکرے لکھے گئے ہیں ان سب میں اس کا پرتو نظر آتا ہے۔ "ادب کی تاریخ" کے رجحان کا آغاز بھی تذکرہ دتاسی سے

ہوتا ہے۔

تذکرہ کریم الدین مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۸ء میں فیلن کی مشارکت سے تذکرہ دتاسی پر بنیاد رکھتے ہوئے اردو میں ایک تذکرہ لکھا جس کا نام طبقات الشعرا[1] ہے لیکن یہ اس کا محض ترجمہ نہیں۔ تذکرہ دتاسی کے برعکس اس کی ترتیب ادوار و طبقات کے اعتبار سے ہے۔ اس میں سنین اور تاریخوں کا التزام بھی کیا گیا ہے۔ کہیں ہجری کہیں عیسوی اور حالات بھی مفصل ہیں۔ شروع میں ایک قابل قدر مقدمہ ہے جس میں تذکرہ اور تاریخ کا فرق اردو اور ریختے کی ابتدا تذکروں کی تنقید دکنی اور برج کا حال دیا ہے۔

مولوی کریم الدین کا خیال ہے کہ اردو کی ابتدا تیمور کے زمانے میں ہوئی۔ تذکرہ کریم الدین کی سب سے بڑی خصوصیت (موجودہ مضمون کے اعتبار سے) "تنقید تذکرہ" ہے۔ مصنف کے نزدیک، "تذکرہ اور طبقات شاخیں فن تاریخ کی ہیں، خصوصاً زبان عرب اور فارسی میں اس قسم کی بہت سی تصنیفیں ہوئی ہیں ان کی دیکھا دیکھی زبان اردو میں بھی اس طریق تصنیف کا استعمال کیا ہے مگر یہ شوق تذکرہ نویسی کا ان ایام میں پیرامون

---

[1] سپرنگر ص ۱۹۱۔

خاطر لوگوں کا ہوا جس سبب بنیاد اردو کی کاہلی ہوئی شروع ہوئی ہے[1]

انہوں نے پرانے تذکروں میں سے میر تقی میر اور علی ابراہیم کے تذکروں کا خاص ذکر کیا ہے مگر اس پر افسوس کیا ہے کہ

"کسی نے اس کو شاخ تاریخ نہ رکھا"

قدیم تذکروں کی ایک بہت بڑی خامی یہ بیان کی ہے کہ تذکرہ نگاروں کو اپنے "خیال کی پختگی" مدنظر ہوتی تھی اور وہ اس فن کو مورد خانہ نظر سے نہ دیکھتے تھے یا پھر اپنی تشہیر اور ناموری مقصود ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں انتخاب اشعار میں خاص بے قاعدگی اور بے پروائی کا ثبوت دیتے تھے تاکہ

"برا ہونا افکار اس شاعر کا ثابت ہو جاوے"

اس کے بعد مولوی کریم الدین نے انتخاب کی قسمیں بیان کی ہیں[2]۔

انتخاب بیاضی :۔ ایک دیوان کا انتخاب خواہ مصنف خود کرے یا کوئی اور

انتخاب دواوین :۔ مختلف شعرا کے دواوین کا انتخاب مثلاً صہبائی کا انتخاب دواوین اور مولوی کریم الدین کا

---

[1] کریم الدین ۔ ص ۲

[2] سپرنگر ص ۱۹۰ دتاسی ص ۹۴۔

گلدستہ نازنیناں[۱] (مطابق ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء)

مولوی کریم الدین کو نکات الشعرا سے یہ شکایت ہے کہ وہ ہر شاعر پر طعنہ آمیز گفتگو کرتا ہے اور چوری شعرا کی بیان کرتا ہے۔ اور جو مقام غیر تحقیق یا معیوب عروض میں پاتا ہے اس کو اصلاح دیتا ہے علاوہ ازیں وہ بیان کرتا ہے کہ میرا تذکرہ سب تذکرہ نویسوں سے اول ہے حالاں کہ یہ غلط ہے[۲]۔

آگے چل کر تاریخ اور تذکرے کا فرق یہ بیان کیا ہے۔

"تذکرہ خاص ہے اور تاریخ عام، کہ وہ تذکروں کو بھی مشتمل ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تذکرہ ایک قسم تاریخ کی ہے بشرطیکہ اس میں ہر شخص کے زمانے کا حوالہ بھی ہو[۳]۔ غرضے کہ تاریخ میں بحث واقعات زمانے سے ہوتی ہے اور تذکرے میں اشخاص کا بیان ہوتا ہے"

اردو شاعری کے ارتقا کے چار طبقے مقرر کیے ہیں۔

۱۔ سپرنگر ص ۱۹۰ دتاسی ص ۹۴۔

۲۔ کریم الدین ص ۱۰۔

۳۔

قسم اول

متقدمین :- ہندی کے قدیم شاعر مثلاً بہاری لعل گوکل ناتھ، داؤد، جائسی۔ کبیر لال کوی نانک وغیرہ خسرو۔ ولی و دیگر شعرائے دکن۔

قسم ثانی

مشتمل بر چہار طبقہ

طبقہ اول :- ان شاعروں کا حال جنہوں نے اردو شعر کہنا شروع کیا۔ فضلی۔ ابجدی۔ اٹل۔ امید۔ آرزو انجام۔ مظہر جان جاناں۔ میر۔ سودا۔ حاتم۔

طبقہ دوم :- بانی اردو اور مصلح اردو جنہوں نے زبان کی ابتدائی اصلاح کا کام کیا! مکھن پاکباز قائم، تاباں، یقین، یکرنگ، انشا، جرأت میر حسن۔

طبقہ سوم :- دوسرے طبقے کے شعرا کے شاگرد۔ انہوں نے زبان کی تراش خراش میں بہت کوشش کی ہے

اور نئے نئے محاورات لاکر زبان اردو کو رونق بخشی۔

نصیر۔ جعفر علی حسرت، حسینی۔ حیدری۔ کاظم علی جوان۔ علی لطف۔

طبقہ چہارم :- ہم عصر شعرا، جن سے مصنف نے ملاقات کی یا جوان کے زمانے میں موجود تھے۔ مومن۔ غالب ذوق وغیرہ۔

خاتمے میں مصنف نے ہر طبقے کے اکابر شعرا کا ذکر کیا ہے لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مولوی کریم الدین نے باوجود تاریخی ذمہ داری کے احساس کے بعض شعرا کو غلط جگہ دی ہے۔ قلی قطب شاہ کو طبقہ ثانی میں سجاد اکبر آبادی کو طبقہ سوم میں۔ ابن نشاطی کو طبقہ دوم میں شمار کیا ہے۔ راجا رام موہن رائے اور سید احمد صاحب بریلوی کو اردو شعرا کے تذکرے میں شامل کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیباچے میں جن اصول و قواعد کا اعلان کیا ہے ان پر پورا پورا عمل نہیں ہو سکا۔

کریم الدین کے نظریے

اب مختصراً اردو کی ابتدا کے بارے میں مولوی کریم الدین کے نظریات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ راجا بھرت کے زمانے میں ہندوستان میں بھاشا کا رواج تھا۔ محمود غزنوی کے

بعد دلی کے قرب و جوار میں پٹھانوں کی عملداری قائم ہوئی۔ یہ بارہویں صدی کا واقعہ ہے قدرتی طور پر مسلمان اور ہندو آپس میں لین دین کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مشترکہ زبان رائج ہوگئی۔

"جب شاہ تیمور نے دہلی پر قبضہ کیا اس وقت یہ زبان مستحکم اور مضبوط ہوگئی۔ اس اثنار میں ایک بازار لشکر کا درمیان شہر دہلی کے مقرر ہوا۔ اس بازار کا نام تاتاری بولی میں اردو رکھا گیا۔ معنی اردو کے مغلوں کی زبان میں لشکر کے ہیں یہ زبان اردو، زبان ہندی اور مغلوں اور مسلمانوں کی بولی سے مرکب ہو کر مستعمل ہوئی جس کو شعرا زبان ریختہ کہتے ہیں۔"

اس کے بعد مولوی کریم الدین دلی اور لکھنؤ کی زبان میں سے دلی کی زبان کی شستگی کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد دکنی ہندی کی اصناف اور مختلف رسم الخط زیر بحث لائے گئے ہیں۔ اردو ادب کی ترقی اور ہندی اور اردو میں فرق کا موضوع بھی چھیڑا گیا ہے۔

میں نے تذکرہ کریم الدین کی کیفیت کسی قدر تفصیل سے اسی لئے بیان کی ہے کہ ہمیں تذکرہ نویسی کے بارے میں ۱۸۴۷ء تک کے معتقدات وخیالات کا اچھی طرح علم ہو سکے اگرچہ ایف۔ ای ہالرائڈ [1]

---

[1] J. R. A. S. 1848 Vol. 17, pt 1, 541

سپرنگر کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی بنیاد دتاسی کے تذکرے پر ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ کریم الدین نے اس کو ایک نئی ترتیب اور ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے ۔ دتاسی کی تصنیف کو بجا طور پر بیاگرافیکل ڈکشنری کہہ سکتے ہیں لیکن تذکرہ کریم الدین اردو شاعری کی تاریخ کی باقاعدہ تدوین کا پہلا قدم ہے ۔ اس کی ترتیب نیم تاریخی ہے اور مصنف کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاعری کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا سارا دائرہ عمل زیر بحث آجائے ۔

دتاسی وغیرہ کا اثر

دتاسی اور کریم الدین کے تذکروں نے آنے والی تصنیفات پر زبردست اثر ڈالا ۔ اب تذکرہ بیاگرافی سے نکل کر تاریخ کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے ۔ اردو زبان کی ابتدا اور اس کا ہندوستان کی دوسری بولیوں سے تعلق اور تشابہ اردو کی عہد بہ عہد ترقی وارتقاء یہ وہ محبوب موضوع ہیں جس پر سب مصنفین توجہ کرتے نظر آتے ہیں ۔

۱۸۵۲ء (مطابق ۱۲۶۹ھ) میں "نسخہ دل کشا" کا مصنف اپنے مجموعہ انتخاب کے دیباچے میں افسانہ اور شعر کے فرق پر بحث کرتا ہے ۔

۱۸۶۸ء (مطابق ۱۲۸۵ھ) میں بابو شیو پرشاد نے بعنوان "کچھ بیان اپنی زبان کا" بنارس انسٹی ٹیوٹ میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں زبان اردو کے قدیم حالات نشو و ارتقا پر اسی رنگ میں روشنی

ڈالی تھی۔ ۱۸۷۲ء (مطابق ۱۲۸۹ھ) میں مولوی عبدالحئی صفا بدایونی نے شمیم سخن کے نام سے ایک تاریخ شعراء لکھی جس کا دیباچہ قابل قدر ہے صفا بدایونی لکھتے ہیں کہ انسانی اخلاق پر شعر کا اچھا اثر پڑتا ہے اور ہمیشہ اس سے اصلاح اخلاق کا فائدہ لیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اردو کے قدیم تذکروں پر نظر ڈالی ہے اور گلشن بے خار کو سب سے معتبر مانا ہے۔ پھر سخن شعرا نساخ، پھر گلستان سخن صابر پھر تذکرہ شعرائے دکن نادر کو اہم قرار دیا ہے۔ گلشن بے خار "انصافانہ تحریر و تحقیق کے لئے، سخن شعرا عمدگی انتخاب کے لئے گلستان سخن" خوبی عبارت کے لئے اور "تذکرہ شعرائے دکن" صنائع بدائع کے لئے امتیاز رکھتا ہے۔ باقی تذکرے ان کے خیال میں نقل در نقل ہیں۔ اس کے بعد زبان اردو اور نظم اردو کی مختصر تاریخ دی ہے[1]۔ جس میں دتاسی اور بابو شیو پرشاد کے نظریات دھرائے گئے ہیں اس کے اجلہ متقدمین کے حالات تاریخی ترتیب سے دیئے ہیں اور عہد بہ عہد تبدیلیاں دکھائی گئی ہیں جو آب حیات سے بہت حد تک مماثل ہیں۔ اس کے بعد ۱۲۸۸ھ (مطابق ۱۸۷۱ء) تک کے شعرا تہجی کی ترتیب سے لائے گئے ہیں۔ آخر میں یہ بحث ہے کہ کس قسم کے شعراء کو اچھا کہہ سکتے ہیں اور اس میں کیا کیا مضمون باندھنے چاہئیں

---

[1] "شمیم سخن" ص ۱۱

پھر چاسر اور ملٹن کی شاعری کا ذکر ہے۔ کتاب کی جلد دوم میں شاعرات کا حال ہے جس میں تعلیم نسواں کے فوائد سے بحث ہے۔

۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء میں درگا پرشاد نادر دہلوی سرہندی نے جو مرحوم دہلی کالج کا تعلیم یافتہ تھا ایک تذکرہ لکھا جس کا نام خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم یا گلدستہ نادر الاذکار تھا اس کا دوسرا مشہور نام تذکرہ شعرائے دکن تھا۔ یہ مخزن الشعرا فائق کا انتخاب ہے اس میں ۲۵۶ شعرا کا حال ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت مصنف نے خود یہ بیان کی ہے کہ

"اکثر تذکرے چھپے ہوئے جو نظر سے گذرے وہ شعرائے دہلوی و لکھنوی کے ذکر سے پر دیکھے۔ کسی نے دکنی شاعروں کا حال نہیں چھاپا، حالاں کہ ، دکن کا شاعر شاہ جہاں آبادیوں پر سبقت لے گیا بلکہ موجد شعر اردو کا ہوا۔"

اس غرض سے نادر نے یہ تذکرہ لکھا۔ میر نے شعرائے دکن کی شاعری کو "نامربوط" قرار دیا تھا اس کے بعد اگرچہ اکثر مصنفین شعرائے دکن کا تذکرہ اپنی کتابوں میں لاتے رہے لیکن میر کے اس الزام کی کامیابی کے ساتھ کسی نے تردید نہیں کی۔ جدید دور میں لوگوں کو دکن کی طرف پھر سے توجہ ہوئی چنانچہ یہ تذکرہ بھی اسی نئی توجہ کا مظہر ہے۔

اس نادر نے شاعر عورتوں کا الگ تذکرہ لکھا ہے۔ جس کا

نام گلشن ناز ہے (۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء) عورتوں کے مستقل تذکروں کی طرف خاص رجحان بھی اسی دور کا خاصہ ہے۔ ۱۲۸۱ھ: ۱۸۶۴ء میں فصیح الدین رنجیں میرٹھ نے "بہارستان ناز" کے نام سے شاعرات کا ایک تذکرہ لکھا تھا۔ ان سب تذکروں میں شمیم سخن کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔

آب حیات اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں مولانا محمد حسین آزاد کی زبردست تصنیف آب حیات پہلی دفعہ شائع ہوتی ہے۔ جس کی آمد سے تذکرہ نگاری کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ اردو ادب میں شاید ہی کوئی تصنیف ایسی ہوگی جس کا جدید نسل کے لوگوں نے اتنا گرم جوشانہ استقبال کیا ہو۔ بقول پروفیسر شیرانی "

" اس کی آمد سے ایک دھوم مچ گئی ہوگی۔ قدردانوں نے اشتیاق کے ہاتھوں سے لیا ہوگا اور شوق کی آنکھوں سے پڑھا ہوگا۔ اردو کیا فارسی میں بھی اس انداز اور پائے کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ جس میں اردو اور فارسی کا مزا موجود ہو اس کی سادہ نثر چھوٹے چھوٹے فقرے۔ ہلکی رنگ آمیزی۔ عبارت کا بانک پن۔ بیان کی

---

۱ آب حیات۔ ص ۴۔

شوخی۔ لطیفوں اور چٹکلوں کی بہتات تاریخ میں افسانے کا ڈھنگ اور نثر میں نظم کا لطف ایسی خصوصیات تھیں جن سے دنیا اس کی گرویدہ ہوگئی۔

دو امتیازی وصف موجودہ موضوع کے اعتبار سے آب حیات کے بڑے امتیازی وصف دو ہیں۔

(۱) تذکرے کا کامل طور پر شاعری کی تاریخ میں بدل جانا۔

(۲) بقول پروفیسر شیرانی تاریخ میں افسانے کا ڈھنگ اور نثر میں نظم کا لطف۔

گزشتہ صفحات پر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اردو تذکروں نے کریم الدین وغیرہ کے زیر اثر تاریخ کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور یہ ایک قاعدہ سا بن گیا تھا کہ تذکرے کے آغاز میں زبان کی ابتدا اور اس کی تدریجی ترقی کا کچھ نہ کچھ حال دیا جائے۔ دلبستان ہبر کے تذکروں میں بھی اس بارے میں کچھ مجمل سے اشارے ہوا کرتے تھے۔ لیکن آخری دور کے مصنفوں نے جدید تحقیقات علمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قسم کی بحثوں کو علمی انداز میں چھیڑا اور فنی اور لسانی حیثیت سے اپنے نظریات کو مربوط اور متین شکل میں پیش کیا۔

ہماری قدیم بیاگرافی میں ایک نقص جس کا آزاد کو پورا پورا احساس ہوا یہ تھا کہ قدیم سوانح عمریوں میں ناموروں کی کی صحیح سرگزشت معلوم نہیں ہو سکتی۔

"نہ اس کے عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے نہ ان کی موت و حیات کے سنین متعین کئے جاتے ہیں اور اگر شاعر ہیں تو ان کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر حقیقی تبصرہ نہیں نہ ان کا ان کے معاصرین کے ساتھ کوئی مقابلہ و موازنہ موجود ہے۔"[1]

مولانا آزاد نے اسی خیال سے اپنے شعرا کی سوانح عمریوں کو حقیقی اور دل چسپ بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ

"جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھیں حیات جاوداں حاصل ہو۔"[2]

مولانا آزاد نے آب حیات میں جن جن مشاہیر اور باکمالوں کی

---

[1] آبحیات۔ ص ۳
[2] " " ص ۴

تصویریں کھینچی ہیں ان کو اس درجہ رنگین اور دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے کہ پچاس ساٹھ سال گزرنے پر بھی لوگ اس کے سحر دل کشی سے آزاد نہیں ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگر کوئی شخص آب حیات پر تنقید کا نام لیتا ہے تو کانوں کو یہ لفظ نامانوس معلوم ہوتا ہے افسوس ہے کہ مولانا نے تاریخ کو افسانے کی طرح دلچسپ بناتے بناتے کہیں کہیں واقعی "افسانہ تراشی" فرمائی ہے اور اپنے بیانات کی بنیاد ایسی روایات پر رکھی ہے جو قیام لکھنؤ کے زمانے میں انہیں حاصل ہوئیں اور آب حیات میں ایک حصہ ایسا بھی ہے۔

"جس کے لئے مولانا کے پاس کوئی تحریری دستاویز موجود نہیں"[۱]

سٹائل کے علاوہ آب حیات کی کشش کا سب سے بڑا سبب اس کے لطیفے اور حکایتیں ہیں جو آب حیات کے اوراق میں جابجا پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض تو مستند ہیں لیکن بعض محض "قیاس کی بلند پروازی" کا کرشمہ ہیں۔ مولانا نے حکیم قدرت قاسم کے مجموعہ نغز سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اس میں بھی جابجا لطیفے اور حکایتیں ملتی ہیں لیکن مولانا نے اسی پر

---

[۱] تنقید آب حیات از پروفیسر شیرانی اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۴۱ء ۔ ص ۶۲ ۔

دارومدار نہیں رکھا بلکہ جہاں سے کوئی دل لبھانے والی بات ہاتھ آگئی درج کر دی ہے۔

مولانا نے اس سلسلے میں جو دل کش مرقع کھینچے ہیں ان میں سے اکثر ڈرامائی انداز اور کیفیت کے حامل ہیں اور قدرتی طور پر ان تصویروں کے رنگ اکثر مولانا کے خود ساختہ ہیں۔ پچھلی کتابوں سے ان کو محض خاکے دستیاب ہوئے ہوں گے، تصویریں انہوں نے خود بنائی ہیں۔

غرض آب حیات اپنی دل کشی اور رنگینی کے لحاظ سے شاید ہمیشہ زندہ رہے گی لیکن ابھی اس کے تحقیقی پہلو پر نظر ڈالنی باقی ہے۔

ادوار اور طبقات کی تعیین میں مولانا پہلے شخص نہیں متقدمین میں میر نے بے قاعدہ اور قائم اور میر حسن نے باقاعدہ طور پر ادوار قائم کئے تھے بعد میں تذکرہ نویسی "لغت" کے انداز کی طرف جھک گئی۔ جب انگریزی اثرات کے ماتحت تذکرہ نویسی میں پھر تاریخی انداز نمودار ہوا تو کریم الدین نے زیادہ نمایاں طور پر طبقات اور دور مقرر کئے اور ہر دور کی خصوصیات بھی قلم بند کیں۔

مولانا آزاد نے کریم الدین کی جامعیت کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر دور کے چند ناموروں کا انتخاب کیا ہے اور اپنے ادوار کی حد بندی

کے لئے باقاعدہ اصول قائم کیے۔[1]

پہلا دور:۔ ولی۔ مبارک آبرو۔ شرف الدین مضمون شاکر ناجی احسن۔ یکرنگ۔

دوسرا دور:۔ شاہ حاتم۔ خان آرزو۔ فغاں۔

تیسرا دور:۔ مرزا مظہر جان جاناں۔ میر۔ سوز۔ میر تقی میر سودا۔ میر درد۔

چوتھا دور:۔ مصحفی۔ انشاء۔ جرأت۔

پانچواں دور:۔ ناسخ۔ آتش۔ شاہ نصیر، مومن۔ ذوق۔ غالب۔

تین تمہیدی مباحث میں اردو زبان کی تاریخ، برج بھاشا پر فارسی کا اثر اور نظم اردو کی تاریخ دی گئی ہے۔ اس میں ہندوستان کی قدیم زبانوں اور پراکرتوں پر محققانہ انداز میں بحث کی گئی ہے فارسی اور سنسکرت کا ہم جنس ہونا ظاہر کیا ہے۔ دتاسی اور کریم الدین وغیرہ کے تتبع میں چاند کوی کا ذکر بھی کیا ہے اور قدیم ہندی شاعروں کے ذکر کے بعد یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ " اردو شاعری کی

---

[1] حال ہی میں مرآۃ الشعر کے نام سے تنہا صاحب نے ایک تذکرہ لکھا ہے جس میں جامعیت کے علاوہ ادوار کی تعیین کے لئے نئے اصول قائم کئے ہیں۔

بولی کا نام اردو ہو گیا۔ اسے فقط شاہ جہاں کا اقبال کہنا چاہیے کہ یہ زبان خاص و عام میں اردو کی طرف منسوب ہو گئی؟ بھاشا پر فارسی نے کیا اثر کیے؟ کے زیر عنوان الفاظ و محاورات کی بحث بھی نہایت پُرلطف ہے اور کتاب کا یہ حصہ جس میں زبانوں کے ایک دوسرے پر اثرات دکھائے گئے ہیں مولانا کی تحقیقی کمال کا بہترین نمونہ ہیں ان تمہیدی مباحث کے اکثر مندرجات کریم الدین وغیرہ میں موجود ہیں مگر انداز بیان اور تکمیل آزاد کے حصے میں آئی ہے کوئی تعجب نہیں کہ اس بارے میں مولانا آزاد دتاسی اور کریم الدین کے علاوہ صابر۔ بابو شیو پرشاد اور مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی کے بھی ممنون احسان ہوں۔

دور اول، دوم اور سوم کے شعراء میں بقول پروفیسر شیرانی تقدیم و تاخیر واقع ہوئی ہے[2]۔ خان آرزو کو دورہ دوم اور آبرو و فغاں کو دورۂ اول میں شمار کرنا قابل اعتراض ہے

پروفیسر شیرانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"شعراء کے تذکرے میں حضرت مولانا نے رقابت اور مقابلے کے پہلو کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ سودا کو میر کا

---

[1] آب حیات ص ۱۹

[2] تنقید آب حیات بہ حوالہ سابق ص ۸۷۔

مصحفی کو انشاء۔ کا، ناسخ کو آتش کا، ذوق کو غالب کا، دبیر کو انیس کا ہم مقابل ٹھہرایا ہے۔ اس نقطہ نظر سے داغ اور امیر مینائی کی شمولیت بہت مناسب ہوتی[1]۔

میرا خیال یہ ہے کہ مولانا کے اس طریقے پر کوئی جائز اعتراض نہیں ہوسکتا اس لئے کہ تقریباً ہر دور میں ادب اور شاعری کے دو حریف دبستان برابر نظر آتے ہیں جن کی سرگرمیوں نے اس عہد کی ساری ادبی زندگی کو متاثر کیا۔ میر و مرزا۔ مصحفی اور انشاء۔ انیس و دبیر کے آپس کے معرکے کسے معلوم نہیں ان حالات میں رقابت کے قابل اعتراض پہلو سے اگر قطع نظر کرلیا جائے تو یہ زیادہ سے زیادہ ادبی کشمکش ہیں جن کا وجود ہر ملک میں ہوتا ہے۔

جب سے انجمن ترقی اردو کی کوشش سے اردو کے قدیم تذکرے چھپنے لگے ہیں۔ آب حیات کے بعض بیانات غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد سے اب تک تنقیدوں کا سلسلہ جاری ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مولانا عبدالحق، شیخ چاند (مصنف سودا) مولانا عبدالحئی (مصنف گل رعنا) اور سب سے آخر میں پروفیسر محمود خاں شیرانی آب حیات کے نقادوں میں ہیں۔ آزاد پر اعتراض دو قسم کے ہیں۔

---

[1] تنقید آب حیات بحوالہ سابق ص ۱۴۲

اول یہ کہ انہوں نے بعض اوقات تاریخی واقعات کے بیان میں بھی انشہ آفرینی کی خاطر محض تخیل سے کام لیا ہے۔

دوم یہ کہ انہوں نے اپنے مخصوص مذہبی رجحانات کی وجہ سے بعض بڑے بڑے شعرا کو ان کا اصل مقام اور رتبہ نہیں دیا۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے نکات الشعرا کے دیباچے میں میر کے خلاف الزام تراشی کے سلسلے میں آزاد سے بے حد ناراضگی کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ آزاد نے نکات الشعرا کو دیکھنے کے بغیر میر کی طرف غلط باتیں منسوب کی ہیں۔ مولانا عبدالحیٔ نے بھی کم و بیش تیس چالیس موقعوں پر آزاد سے اختلاف کیا ہے۔ پروفیسر شیرانی جنھیں مولانا آزاد کی کتابوں سے ہمیشہ دل بستگی رہی ہے وہ بھی آب حیات کے نقادوں میں شامل ہیں۔ ان کی تنقید آب حیات ۱۹۳۱ء میں اورینٹل کالج میگزین میں باقساط شائع ہوئی ہے[1]۔ اس میں انہوں نے آب حیات کے واقعات اور نظریات دونوں پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور آزاد کے بیانات کا جدید تاریخی تحقیقات کی روشنی میں تجزیہ کیا ہے[2]۔

---

[1] اگست و نومبر ۱۹۳۱ء

[2] شاہ سر سلیمان نے انتخاب مثنویات میر کے دیباچے میں آزاد کی بڑی طرفداری کی ہے۔

یہ سب تنقیدیں اور اصلاحیں بہت قابل قدر اور لائق ستائش ہیں۔ جس قدر انسانی علم ترقی کرتا جاتا ہے اور نئی نئی باتیں دریافت ہوتی جاتی ہیں۔ اسی قدر پرانی کتابوں میں ترمیم و اصلاح کی گنجائش زیادہ ہوتی جاتی ہے اور ایک لحاظ سے یہ بہت اچھی بات ہے کیوں کہ اس سے کتابوں کے داغ دھل جاتے ہیں اور نقائص کم ہو جاتے ہیں اور خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ آب حیات کے طلسم اور طرز آزادگی دل کشی سے دل ہمیشہ مسخر رہیں گے۔ اس کی یہ مقبولیت اگرچہ فیض ربانی کے طفیل ہے مگر در اصل اس کی معنوی خوبیاں اور محاسن بھی فیض الہٰی کے لئے جاذب ثابت ہوئے ہیں۔ بعد کے مصنفوں میں جلوۂ خضر کے مصنف صفیر بلگرامی اور تاریخ زبان اردو کے مصنف منشی چرنجی لال نے آزاد کے سرچشمہ فیض سے بہت اکتساب کیا ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ اس کے بعد کی ساری تصنیفات بالواسطہ یا بلا واسطہ آزاد کے طرز اور اس کے اسلوب تدوین کا پرتو لئے ہوئے ہیں۔

۳۔

تنقیدِ تذکرہ

تذکروں پر اعتراضات میں تذکروں کے محاسن سے پہلے ان کے نقائص کو لیتا ہوں۔ تذکروں کے نقائص دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

(ا) قدیم

(ii) جدید۔

قدیم اعتراضات وہ ہیں جو پرانے تذکرہ نویسوں نے حریف تذکرہ نگاروں پر کیے ہیں۔ (اور)

جدید اعتراضات وہ ہیں جو اس زمانے کے نقادوں کی طرف سے ہو رہے ہیں۔ جدید کا آغاز تقریباً دتاسی کے زمانے سے ہوتا ہے۔

متقدمین کے اعتراض قدیم تذکروں میں گردیزی پہلے شخص ہیں جنہوں نے میر کے تذکرے پر (اس کا نام لئے بغیر) اعتراض کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بعض اخوان زبان ہونے ریختہ گویوں کے جو تذکرے سپرد قلم کیے ہیں ان میں چند کم زور بیان

ہیں[1]۔

اوّل :۔ یہ کہ انہوں نے ہمسروں اور معاصروں پر بے جا خوردہ گیری کی ہے اور ان کے حالات میں بے حد اختصار سے کام لیا ہے۔

دوم :۔ انہوں نے اکثر "نازک خیالوں" کو نظر انداز کر دیا ہے۔

سوم :۔ حالات شعرا میں صریح غلطیاں کی ہیں۔

گردیزی کی یہ تنقید اصل میں گروہ بندی کی عصبیت پر مبنی ہے۔ اس کی صدائے بازگشت تقریباً تمام ان تذکروں میں سنائی دیتی ہے جو کسی نہ کسی طریق سے میر کے مخالف گروہ سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً مجموعہ نغز اور چمنستان شعرا میں میر صاحب کے تذکرے پر تہمت لے دے کی گئی ہے۔

حکیم قدرت اللہ قاسم مجموعہ نغز میں گردیزی کے اس اعتراض کو دہراتے ہیں[2]

"در تذکرہ خود ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ"

اسی طرح صاحب چمنستان بھی میر صاحب پر بہت برسے ہیں اور

"چاہ کن را چاہ در پیش"

---

[1] گردیزی ص ۲

[2] مجموعہ نغز ج ۲ ص ۲۳۰

کی دھمکی دے کر اشعار میر کو قابل اصلاح گردانتے ہیں ہمارے مولوی کریم الدین بھی اسی طوفان میں بہ گئے ہیں اور اپنے تذکرے میں میر کو "عیب چینی" کے لئے مطعون کرتے ہیں۔ ان بیانات سے قدیم اعتراضات کا عام رنگ ظاہر ہو سکتا ہے۔ میر صاحب کا تذکرہ

(۱) اصلاح سخن

(۲) تنقید کلام

(۳) تصویر سیرت کے لئے ممتاز ہے مگر میر کے معترضین ان کی بے لاگ تنقید کو "تنقیص" قرار دیتے ہیں اور اصلاح سخن کو خوردہ گیری اور عیب چینی سمجھتے ہیں۔

جدید معترضین جدید معترضین میں دتاسی سب سے پیش پیش ہیں۔ خطبات[1] میں انہوں نے اردو تذکروں کے مندرجہ ذیل عیوب گنائے ہیں۔ ان کی رائے میں

۱۔ ان تذکروں کا مقصد دوستوں کی مدح سرائی ہے یا اپنی روشناسی کا سامان۔

۲۔ یہ دراصل بیاضیں ہیں۔ تذکرے نہیں ہیں۔ ان میں ذاتی حالات کی کمی ہے۔

۳۔ ان میں سنین کی کمی ہے اور تاریخ وفات و واقعات بہت کم

---

[1] خطبات (ترجمہ اردو۔ انجمن ترقی اردو)

دی گئی ہے۔

۴۔ کم پایہ شعراء کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

۵۔ ایک ہی نام کے دو شعراء کے بارے میں التباس ہوتا ہے۔

دتاسی نے تذکروں[1] میں ان عیوب کے علاوہ ایک خامی یہ بھی ظاہر کی ہے!

۶۔ کہ یہ تذکرہ نویس نہ چاہتے تھے کہ اپنے علاوہ کسی اور کے نام کا ذکر کریں۔ دتاسی کے نزدیک تذکروں کا ایک اچھا پہلو بھی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

"ان میں کوئی کام کی چیز ہے تو وہ شعراء کے کلام کا انتخاب ہے جو یورپ میں مفقود ہے۔" لیکن کلام سے زمانے کا پتہ چلانا مشکل ہوتا ہے۔

مولوی کریم الدین کا تذکرۂ شعراء (جو دتاسی کا ترجمہ یا چربہ ہے) دتاسی ہی کے اعتراضات کو دہراتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے!

کہ ان تذکرہ نگاروں نے تذکرے کو تاریخ کی شاخ نہ رکھا۔" اس کے علاوہ ان تذکرہ نگاروں کو اپنے "خیال

---

[1] تذکرہ شعراء دتاسی کا دیباچہ (ترجمہ از مولوی محفوظ الحق) معارف اگست و ستمبر ۱۹۲۲ء

کی پختگی" مدِ نظر ہوتی تھی اور اس فن کو مورخانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنی تشہیر مقصود تھی یا دوسروں کی تنقیص تاکہ دوسرے شعرا کا پایہ کم ہو جائے۔"

مولوی صفا بدایونی "شمیم سخن" میں فرماتے ہیں!

۱۔ کہ اردو کے سالقہ تذکروں میں انتخاب عمدہ نہیں۔

۲۔ اور تذکرہ نویسی رورعایت کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔

درگا پرشاد نادر کا اعتراض یہ ہے کہ ان تذکروں میں شعرائے دکن کی طرف توجہ کم کی گئی ہے۔

صاحب خم خانہ جاوید فرماتے ہیں کہ

مختلف تذکروں میں ہے افسوس کہ کوئی بھی دل میں نہ کھپا۔"

آبِ حیات تک میں ان کو یہ نقص نظر آتا ہے کہ

انتخاب کافی اور عمدہ نہیں۔ کلام بھی لیا تو محض بہ طور نمونہ، انتخاب کا خط تک نہ آنے دیا۔ عام تذکروں میں خاص و عام کے درمیان امتیاز ہی نہیں۔ بھرتی کے اشعار سے کتابوں کو پُر کر لیں۔ گلستان سخن نے صرف دہلی کے شعرا کی حمایت کی ہے۔

مولانا آزاد "آبِ حیات"[۱] میں تذکروں پر تاریخ شعر اور

۱۔ آبحیات ص ۴

بیاگرافی کے نقطہ نظر سے انگلی اٹھاتے ہیں۔ ان کی شکایت یہ ہے کہ

"ان سے نہ کسی شاعر کی سرگذشت کا حال معلوم ہوتا ہے نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے نہ اُس کے کلام کی خوبی اور صحت و سقیم کی کیفیت کھلتی ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اور سال وفات تک بھی نہیں کھلتا۔[۱]

تذکروں کے جدید نقادوں میں مولانا عبدالحق کی رائے بے حد متوازن ہے (جیسا کہ تذکروں کے مطالعہ کے ضمن میں معلوم ہوگا) ڈاکٹر سید زور نے تذکرہ گلزار ابراہیم پر جو دیباچہ لکھا ہے اس میں انہوں نے بھی تذکروں کے متعلق عمدہ تنقید کی ہے انہوں نے تذکروں کے تین درجے مقرر کیے ہیں۔

اول :- وہ جو کسی شاعر نے قلم سے لکھے گئے

دوم :- وہ جو کسی بڑے شاعر کے خاص معتقد نے لکھے

سوم :- وہ جو کسی شاعر کے قلم سے نہیں بلکہ کسی سخن فہم کے قلم سے لکھے گئے۔ ڈاکٹر زور تیسری قسم کے تذکروں کو درجۂ اول کی تصانیف قرار دیتے ہیں۔ دوسری قسم میں ان کے نزدیک استاد اور استاد بھائیوں کی طرف داری کا کام قصد مد نظر

---

[۱] آب حیات ص ۸

ہوتا ہے۔ اس لیے اس قسم کے تذکروں میں شدید رو رعایت اور جانب داری نمایاں ہے۔ قسم اول کے تذکرے چوں کہ خود بڑے شاعروں کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں اس لیے ان کو اہم ادبی تنقید کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے[1]

ڈاکٹر زور فرماتے ہیں کہ یہ واقعی اردو شاعروں کی بد قسمتی ہے کہ کسی نے بھی ایک ٹھیٹ مورخ بن کر شعرا کے حالات کو قلم بند نہ کیا اگر اس طرح کی کوئی کوشش ملتی ہے تو وہ صرف علی ابراہیم کا تذکرہ ہے لیکن اس میں بھی یہ خامی ہے کہ اس کی ترتیب ہجائی ہے۔[2]

اردو تذکرہ نویسی کے ہر دور میں بعض لوگوں کی طرف سے مستند تذکروں پر "صوبہ پرستی" اور "خطہ پرستی" کے اعتراضات بھی ہوتے رہے ہیں لیکن یہ اعتراض عموماً خود بھی صوبہ پرستی اور خطہ پرستی کے جذبے کی پیداوار ہیں۔

---

[1] مولانا عبدالسلام۔ شعر الہند (ج ۱۔ ص ۲) میں فرماتے ہیں "لیکن افسوس ہے کہ آج تک اردو زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی جو اردو شاعری کے تمام انقلابات و تغیرات کو نمایاں کرتی اور اس سے یہ معلوم ہوتا کہ انواع شاعری کی ترقی کے لحاظ سے موجود زبانوں میں اردو کا کیا درجہ ہے۔

[2] دیباچہ گلزار ابراہیم ص ۲۔

اعتراضات کا خلاصہ میں نے اردو تذکروں پر اعتراضات کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے مقصود یہ ہے کہ ہمیں ایک طرف اعتراضات کا مقصد معلوم ہو جائے اور دوسری طرف اردو تذکرہ نویسی کی تحقیقی خامیاں ہمارے سامنے آجائیں۔ ان اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے۔

۱ ۔ کہ تذکرہ نگاروں کا مقصد صداقت اور انصاف نہ تھا بلکہ وہ رورعایت سے کام لیتے تھے، جانب داری ان کا شعار تھا اور خودستائی ان کا مقصود۔

۲ ۔ تذکروں میں تحقیق وتنقید نہیں۔ محض انتخاب کلام ہے اور جامعیت کی کوشش کے پیش نظر خاص وعام میں امتیاز قائم نہیں رکھا۔

۳ ۔ ان میں تاریخیں نہیں ملتیں اور ان کی تدوین میں تاریخ نگاری کے اصول پر عمل نہیں کیا گیا۔

۴ ۔ ان سے شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور نشیب وفراز کا پتہ نہیں چلتا۔

۵ ۔ ان سے مفصل حالات معلوم نہیں ہوتے اور تحقیق کی بجائے نقل درنقل ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں مآخذ کا ذکر نہیں ہوتا۔

ان اعتراضات کی حقیقت یہ وہ چند اعتراضات ہیں جو بار بار مختلف الفاظ اور پیرایوں میں دہرائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن کوئی انصاف پسند آدمی دتاسی کے اس خیال سے متفق نہیں ہو سکتا کہ

"ان تذکروں میں خوبیوں کے مقابلے میں عیوب زیادہ ہیں۔[1]"

بلکہ واقعہ شاید اس کے برعکس ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اردو تذکروں میں خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ مگر خامیوں کے مقابلے میں خوبیاں زیادہ ہیں۔

دراصل مشرق اور مغرب میں جو اختلافات مذاق فطری طور پر موجود ہے وہ بھی دتاسی کی اس تلخ تنقید کا ذمہ دار ہے لیکن یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے اردو تذکرہ نویسی پر زیادہ بڑھ بڑھ کر اعتراض کئے ہیں وہ اپنے تذکروں میں خود بھی ان خاص عیوب سے (جو انہوں نے قدماء کے تذکروں میں ظاہر کئے ہیں) محفوظ نہیں رہ سکے۔ مثال کے طور پر دتاسی کو لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ تذکروں میں کم پایہ شعرا کا ذکر نہ ہونا چاہئے

---

[1] خطبات دتاسی (انجمن ترقی اردو) ص ۵۹

اور اس سلسلے میں کوپر کا یہ اقتباس نقل کرتا ہے[1] کہ۔

"ایسے بے حقیقت ناموں کو جو بھولنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ غیر فانی شہرت دینے کی کوشش سعئ لاحاصل ہے۔ تاریخوں میں ان کا ذکر کرنا کہ آئندہ نسلیں ان کی طرف متوجہ ہوں محض بے کار ہے۔"

لیکن یہی دتاسی جب خود تذکرہ لکھنے بیٹھتا ہے تو کم و بیش تین ہزار اردو ہندی شعرا کا حال لکھ مارتا ہے اور اپنے تذکرے میں اس کے لئے یہ عذر پیش کرتا ہے[2]۔

"کہ میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ گو دو چار سطریں ہی کیوں نہ ہوں ان کا ذکر کر دینا ضروری ہے کیوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بالکل گم نام رہ جائیں"

اسی طرح دتاسی کا ایک اعتراض یہ تھا کہ پرانے تذکرے بہ ترتیب حروف تہجی ہیں لیکن اپنے تذکرے میں اس نے یہی ترتیب قائم رکھی ہے اور تاریخی ترتیب کی دقتوں کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

"میرا ارادہ تھا کہ میں تاریخی ترتیب قائم کروں

---

[1] خطبات ص ۵۷

[2] دیباچہ تذکرہ دتاسی (معارف ۱۹۲۲ اگست)

لیکن مواد کافی موجود نہ تھا[1]

تذکرہ نگاری کی مشکلات

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے. کہ تذکرہ بہ حیثیت نوع ادب ایک پیچیدہ اور نازک صنف ہے. اس کی مشکلات اور پر پیچ ذمہ داریاں اس قدر زیادہ ہیں کہ اس میں کامیابی حاصل کرنا صرف اعلی درجے کے تذکرہ نگاروں کا کام ہے اور ہر کردمہ کے بس کی بات نہیں۔"

انگریزی کے تذکرۃ الشعرا کے مصنف ڈاکٹر جانسن نے تذکرہ نویسی کی دقتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا[2]

"Every other author may aspire to praise but the lexicographer can only hope to escape reproach"

یہ وہ خار زار ہے جس میں الجھ کر دستہ گل کا ہاتھ آنا تو بجائے خود "نزاع سر خار" سے ہی پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے.

---

[1] دیباچہ تذکرہ دتاسی (معارف ۱۹۲۲۔اگست)

[2] Longekar - English Biography in the 18th century, p. 239, p, 239

اور تذکرہ نگار اس پر بھی خداوند تعالیٰ کی عنایت کا سپاس گزار ہوتا ہے کہ الحمد للہ معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ بقول غالب

زمانہ سخت کم آزار ہے بہ جان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

تذکرہ ایک مرکب صنف ہے

درحقیقت تذکرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک مرکب نوع تصنیف ہے۔ وہ اجزا جن پر ایک تذکرہ عموماً مشتمل ہوتا ہے تین ہیں۔ قدیم زمانے میں تذکروں کو عموماً اصلاح ذوق اور تنقید کلام کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ کچھ تذکرے ایسے بھی تھے جن کا مقصد سادے بڑے بڑے شعرا کے حالات زندگی اور ان کا منتخبہ کلام پیش کرنا تھا۔ بعض تذکرہ نویس تذکرے کو "لٹریری ہسٹری" بنا کر اس کو تاریخ کے مرتبے پر پہنچانا چاہتے تھے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ اپنے اپنے جداگانہ مقاصد کے باوجود ڈھنگ تذکرہ نویسی کا ہی قائم رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ جدید اصطلاحات کی رو سے ان کے تذکروں میں بیاگرافیکل ڈکشنری (قاموس) لٹریری ہسٹری (تاریخ ادب) اور لٹریری کرٹسزم (تنقید ادب) کے عناصر سہ گانہ یک جا مجتمع ہو جاتے تھے۔ یہ فرق کہ کون سا تذکرہ کس خاص مقصد سے لکھا گیا ہے صرف کتاب کے تمام میلانات سے ہی ظاہر ہو سکتا ہے۔ ورنہ مندرجہ بالا تینوں حیثیات اس طرح

لا ینفک طور پر باہم ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہ ان پر الگ الگ تنقید ناممکن ہو جاتی ہے۔

تذکرہ نویسی کی اس خصوصیت کو عیب کہیئے یا خوبی یہ اپنے اپنے معیار اور اصول کی بات ہے لیکن معترضوں کے بہت سے اعتراضات کی اصل بنا یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے رجحان طبع کے مطابق تذکرے پر نظر ڈالتا ہے۔

کوئی اس کو جامع اور مفصل دیکھنا چاہتا ہے کوئی اس میں عمدہ اور بہ کثرت انتخاب کا متلاشی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس میں لٹریری ہسٹری کے انداز پر ادوار کی تاریخیت موجود ہونا چاہیئے کسی کا یہ ارشاد ہے کہ سیرت کی دقیق باریکیاں دکھلا کر ہر تصویر کو ہو بہو اور مکمل بنانا چاہیئے۔ کوئی یہ خواہش کرتا ہے کہ کاش اردو تذکروں میں تنقید ہوتی۔!

غرض ہر فرد تذکروں میں اپنے اپنے میلان کی جستجو کرتا ہے اور اس کے علاوہ باقی پہلوؤں کو عموماً نظر انداز کر دیتا ہے۔

تذکرہ اصولاً سیرت سے متعلق ہے

واقعہ یہ ہے کہ تذکرۃ الشعرا کو سب سے پہلے "سیرت" ہونا چاہیئے اور پھر لٹریری ہسٹری اسی طرح اس کا خالصۃً کتاب النقد ہو جانا بھی درست نہیں۔ تذکرہ فن سیرت کی ایک شاخ ہے۔ دنیا میں "ہیرو" لاکھوں۔ کروڑوں میں

سے صرف چند آدمی ہو سکتے ہیں۔ مگر انسانی تہذیب کی ترقی اور تعمیر میں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد حصہ لیتے ہیں وہ سب اس بات کا استحقاق رکھتے ہیں کہ دنیا ان کے نام اور کام سے بہ تفصیل نہ سہی بالاجمال ہی روشناس ہو۔ بیاگرافیکل ڈکشنری اسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ایجاز اس کے لئے ایک ضروری صفت ہے اور ضروری جزئیات کا انتخاب اس کے لوازم میں سے ہے اس کی ترتیب اتنی آسان اور علمی قسم کی ہونی چاہئے کہ متلاشی بغیر کسی وقت کے مطلوب تک پہنچ جائے اس بنا پر اس کے لئے "ہجی ترتیب" سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ سر لیزلی سٹیفن[1] (Sir Leslie Stephen

---

[1] A dictionary ought in the first place to supply you with sufficient indiction of all that has been written upon the subject. It should state briefly the result of the last researches: explain what appears to be the present opinion among the most

بقیہ صفحہ ۱۱۷ پر

نے اپنی قاموس الاعلام (Dictionary of National Biography

میں بیا گرافیکل ڈکشنری کے لوازم پر بحث کرتے ہوئے اس کے متعلق چند ضروری شرطیں قائم کی ہیں۔ مثلاً

۱ ۔ مختصر طور پر ضروری معلومات کی فراہمی ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶ کا

qualified experts and what are the points which still seem to be open: and above all should give a full reference to all the best and most original sources of information. The most important and valuable part of a good dictionary is often that dry list of authorities that frequently costs an amount of skilled labour not apparent on the surface and not always it is feared recognised with due gratitude'
(Studies of a Biographer, Vol. 1. p. 18)

۲ - اختصار کو مدنظر رکھنا۔

۳ - جزئیات کا انتخاب کرتے وقت ضروری اور غیر ضروری میں امتیاز کرنا۔

۴ - مفصل مطالعے کے لئے دوسری کتابوں کے حوالے۔

۵ - ترتیب کا آسان اور عام فہم ہونا اور تاریخی ترتیب کا بہتر ہونا وغیرہ وغیرہ۔

جالنسن کا تذکرہ شعرا انگریزی میں جالنسن کا تذکرۃ الشعراء ہمارے تذکروں سے قدرے مشابہت رکھتا ہے۔ کیوں کہ لانگے کر[1] کی تعریف و تشریح کی رو سے یہ تذکرہ تقریباً انہی عناصر پر مشتمل ہے جس سے ہمارے تذکرے مرکب ہیں۔ جالنسن کے تذکرے کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

۱ - اس میں زندگی کے نمایاں واقعات کو تاریخی ترتیب دی گئی ہے

۲ - سیرت کی تصویر اور تجزیہ بے مثال ہے۔

۳ - شعراء کے کلام پر جچی تلی آراء ہیں۔

۴ - جالنسن نے اپنی پسند و ناپسند کے لئے دلائل دئے ہیں۔

۵ - اسٹائل نہایت دل کش ہے۔

ممکن ہے کہ اردو تذکرے خالص مغربی طرز کے تذکروں سے

---

[1] لانگے کر ص ۲۳۷ ومابعد

مطابق النعل بالنعل "، نہ ملتے ہوں لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اعلیٰ مرکزی (یا درجہ اول کے) تذکرے جن کا گزشتہ اوراق میں ذکر آچکا ہے فنی اعتبار سے جانشن کے تذکرے کی بہت سی خصوصیات کے حامل ہیں اور کار آمد ہیں۔

تاریخیت بعض اردو تذکروں کے اس عیب کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس میں واقعات کی "تاریخیت" ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ سنین تقریباً مفقود ہیں اور تاریخ وفات کا اکثر پتہ نہیں چلتا اور اس معاملہ میں تذکرہ میر سب سے زیادہ قصوروار ہے۔ اگرچہ دیگر بڑے چھوٹے تذکرے بھی اس الزام سے کاملاً بری نہیں تاہم "پوری تاریخیت" نہ ہونے کے باوجود ان میں بعض ایسے حالات و واقعات مل جاتے ہیں جن سے سنین معین کئے جاسکتے ہیں۔ بہت سے تذکرے ایسے بھی ہیں۔ جن میں سنین کا پورا پورا التزام ہے۔ میر حسن، مصحفی اور شفیق وغیرہ نہایت کوشش سے تاریخیں دیتے ہیں۔ گلزار ابراہیم۔ گلشن ہند اور تذکرہ کریم الدین کی تو خصوصیت ہی یہ ہے کہ ان میں جدید اثرات کی فضا میں تاریخی حس خاصی بیدار نظر آتی ہے۔ چنانچہ اسی تاریخیت کا ایک پہلو ادوار کی تعیین بھی ہے مخزن نکات (قائم) تذکرہ میر حسن اور کریم الدین کے تذکرۂ شعرا میں ادوار تاریخی موجود ہیں بلکہ بے قاعدہ طور پر خود میر کے تذکرے میں بھی طبقے نظر آتے ہیں۔

عین اس زمانے ۱۱۶۵ھ مطابق ۵۱-۱۷۵۰ء میں جب میر صاحب اپنا تذکرہ لکھتے ہیں "نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ مطابق ۵۱-۱۷۵۰ء" ڈاکٹر جانسن کا تذکرہ شعرا انگریزی میں لکھا جاتا ہے اس میں بھی کم و بیش وہی نقائص نظر آتے ہیں جو اردو تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ انگلستان میں تو اٹھارہویں صدی سے قبل بیاگرافی مستقل نوع ادب کی حیثیت سے موجود ہی نہ تھی۔[1]

جانسن کے دور تک جس قدر قاموسیں لکھنے میں آئیں ان میں تحقیق و تدقیق کی بڑی کمی نظر آتی ہے انتخاب واقعات کا معیار پست تھا۔ ترتیب پر پیچ اور وقت طلب۔ معلومات ناقص تھیں پھر کبھی ترتیب کا التزام بھی کم ہے۔ جو کچھ مطلوب ہوتا ہے اس کا تلاش کرنا "جوئے شیر لانے" کے مترادف ہے۔[2] اس لحاظ سے ہمارے تذکرے انگریزی کے اس دور کے تذکروں سے بدرجہا بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

با ایں ہمہ یہ اقرار کرنا چاہئے کہ اگر ہمارے اعلیٰ تذکروں میں تاریخیں دی جاتیں تو یقیناً یہ مکمل تصنیفیں بن جاتیں اور ان کا پایہ بہت بلند ہو جاتا۔

---

[1] Longekar - English Biography p.3

[2] ایضاً ص ۲۴

ایجاز و اختصار یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے تذکروں میں سیرت کی مکمل اور مفصل تصویریں موجود نہیں بیاگرافیکل ڈکشنری کی ضروریات کے متعلق پہلے بحث آچکی ہے اس کے پیش نظر یہ بے حد ضروری ہے کہ اس میں صرف نمایاں اور پر "معنی" واقعات کو جمع کیا جائے جس سے "اشخاص تذکرہ" کی زندگی کے ممتاز رجحانات معلوم ہو جائیں اور ذہن خود بہ خود سیرتوں کا اندازہ لگا سکے۔ اردو کے بڑے اور مرکزی تذکرے اسی اصول پر کاربند ہیں۔ ان میں a series of highly significant facts یعنی چند نہایت معنی خیز واقعات درج کیے جاتے ہیں اس بارے میں میر کا تذکرہ سب پر فوقیت رکھتا ہے اس میں تصویر سیرت کے لئے جو پُر اعجاز ایجاز اختیار کیا گیا ہے اس سے اس تذکرے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

وہ تمام تذکرے جو میر سے متاثر ہوئے ہیں اسی انداز کے حامل ہیں۔ مگر جدید اثرات نے ایجاز کی بجائے تفصیل کا رخ اختیار کیا ہے۔ گلزار ابراہیم اور گلشن ہند علی لطف مفصل تذکرے ہیں۔ مگر ان میں وہ خوبی نہیں جو تذکرۂ میر کے خاکوں میں ہے۔ میر کے مقابلے پر جن تذکروں نے مفصل تر اور جامع تر ہونے کی کوشش کی ان میں لفاظی اور رنگ آمیزی زیادہ ہے۔ چنانچہ مجموعہ نغز میں ایک

ایک شاعر کے القاب دو دو سطروں میں کھینچے چلے جاتے ہیں۔ باایں ہمہ اردو کے مفصل سے مفصل تذکروں میں نہ تو طوالت، اور اطناب، نہیں جو "تذکرہ" کو ایک شخص واحد کی سیرت" کے درجے تک پہنچا دے۔ سب تذکرے صرف ضروری اور چیدہ چیدہ واقعات دیتے ہیں جن سے ہر شاعر کی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس بارے میں اردو تذکرہ نویسی فنی معیار سے بہت دور نہیں۔

سلیم الطبعی اور نیک دلی ہمارے تذکرہ نگاروں نے معاصروں اور بزرگوں کی سیرت اور کلام کے کم زور پہلوؤں کے دکھانے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔

اول تو "خطائے بزرگان گرفتن خطا ست" کے مصداق ان کے نظریہ اخلاق میں یات ناروا تھی کہ "بزرگوں" کے عیوب اور کمزوریاں چن چن کر ظاہر کی جائیں۔ ان کے نزدیک یہ "حقیقت نگاری" نہیں بلکہ حقیقت کی تردید ہے۔ انسان لازماً سہو و خطا سے مرکب ہے۔ اس لئے انسان کے کمزور پہلو کو نمایاں کرنا قدما کے نزدیک تحصیل حاصل تھا۔ ان کے نزدیک لغزشوں کی تفصیل کی بجائے یہ امر زیادہ قابل توجہ تھا کہ کسی فرد بشر نے انسانی شرف و کمال میں کیا درجہ حاصل کیا پھر وہ یہ بھی نہ چاہتے تھے

کہ بیاگرافی لوگوں کی غلط تربیت کا ذریعہ بن جائے۔ انہیں ڈر تھا کہ ناپختہ طبائع اپنی خطا کاریوں کے لئے بزرگوں کی غلطیوں سے سند جواز حاصل کرنے لگ پڑیں گی۔ سیرت میں سچائی کو قائم رکھنا ان کا شعار تھا لیکن "سیرت" ان کے نزدیک سائنس یا آرٹ نہ تھی بلکہ باقی شعبہ ہائے علم کی طرح خدمت علم اور تزکیۂ اخلاق کا ایک ذریعہ تھی۔ لوگ اس کو اپنے لئے اسوۂ عمل بناتے تھے اور پرانی سیرتوں میں اپنے لئے نسخۂ ہدایت تلاش کیا کرتے تھے اس لئے سخت مجبوری کے بغیر عموماً خودہ گیری اور عیب چینی سے بچا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "محتسب را درون خانہ چہ کار" کہہ کر اپنے "ناموروں" کی اندرونی زندگی کے عیوب ونقائص اور ان کی لغزشوں سے الگ ہو کر "ہمہ را بہ نیکی یاد کردن" کے اصول پر عمل پیرا ہو جاتے تھے۔

سیرت نگاری کا جدید نظریہ "طشت از بام افگندن" اور "پوست کندن" کا متقاضی ہے۔ ہمارے بزرگ یقیناً اس اصول کے سخت مخالف تھے اور اس زمانے میں نہ صرف مشرق میں بلکہ خود بلاد یورپ میں بھی مصنفین اس سے احتراز کیا کرتے تھے۔ ٹینی سن (Tennyson) نے اسی لئے ڈانٹ کر کہا تھا کہ

پبلک کو بائرن کی آشفتہ مزاجیوں اور بے راہ

رویوں کے جاننے کا کیا حق ہے اس نے دنیا کو
پاکیزہ کلام اور افکار نغز دیئے ہیں۔ اہل دنیا کو
صرف اسی سے مطمئن ہو جانا چاہیے[1]

"یادگاری" خصوصیات

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے انگریزی سیرت نگاروں کی طرح ہمارے سوانح نگاروں کے پیش نظر بھی یادگار اور اسوہ قائم کرنے کا مقصد تھا۔ یہ تذکرہ نگار اپنے "ناموروں" میں نیکی شرافت، پابندی وضع، خوش اخلاقی اور عام اوصاف حسنہ کو بطور خاص نمایاں کرتے ہیں۔ جس طرح وکٹوریہ کے زمانے میں سوانح نگاروں کے ہیروں عالی حوصلہ، بے تکلف پاکیزہ سرشت لیکن جابر متشدد ہوتے تھے[2] اسی طرح ہمارے تذکرہ نگار اپنے نامور شعراء میں رائج الوقت اوصاف حمیدہ کا سراغ لگاتے ہیں۔ نکات الشعرا کے دیباچے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تحریر فرماتے ہیں[3]:

---

[1] Andre Maurois
Aspects of Biography, p. 15

[2] Andre Maurois
Aspects of Biography, p. 24

[3] ص ۱۷، نیز دیکھو تذکرہ میر حسن۔ دیباچہ از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ص ۱۴۔

"میر صاحب کے بیان کو غور سے پڑھو تو صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے شرفا کی خصوصیات یہ تھیں۔ خوبیٔ اخلاق۔ زندہ دلی۔ محبت، محبت کا نباہ علم و فن کا ذوق اور اس کی خدمت، سپہ گری اور خودداری و وضع داری۔ نکات الشعراء میں میر تقی میر ان اوصاف کے عدم و وجود پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ رکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انہی صفتوں پر نگاہیں پڑتی تھیں۔"[۱]

جملہ معترضہ شروانی صاحب نے جن اوصاف کا ذکر کیا ہے ان میں ایک چیز وضع داری بھی ہے۔ یہ استقلال مزاج اور ثابت قدمی کا محیر العقول نمونہ پیش کرتی ہے مراد اس سے یہ ہے کہ ہمارے بزرگ شروع میں جس وضع یا طریقے کو اختیار کر لیتے تھے۔ عمر بھر اس پر قائم رہا کرتے تھے۔ یہ درحقیقت مولٰنا آزاد[۲] کے بہ قول۔

"ایک قانون تھا کہ آئین شریعت کے برابر پہلو مارتا ہوا جاتا تھا۔ ایسی پابندیاں بعض معاملات میں استقلال بن کر ملک اور اہل ملک کے لئے قابل فخر ہوتی ہیں اور

---

۱ ص ۱۷، نیز دیکھو تذکرہ میر حسن دیباچہ از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ص ۱۴

۲ آب حیات۔ آزاد۔ ص ۱۰۵۔

بعض جزئیات میں تکلیف بے جا ہو کر خاندانوں اور گھرانوں کو بلکہ عام ہو کر ملک کو برباد کر دیتی ہیں۔"

ہمہ را بہ نیکی یاد کردن

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ تذکرہ نگار غلط طور پر یہ عملہ اوصاف اپنے ناموروں کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

اس معاملہ میں تذکرہ نگار بڑی راست بازی سے کام لیتے تھے تذکروں کے اوراق میں ہزاروں شاعروں کے حالات درج ہیں۔ ان میں سے جو لوگ حقیقی عظمت کے مالک ہیں صرف انہیں کے عالی اوصاف کا خاص تذکرہ ہوا ہے۔ باقیوں میں بھی علی قدر مراتب جو خوبی نظر آئی ہے درج ہو گئی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ "ہمہ را بہ نیکی یاد کردن" کا اصول بیشتر مدنظر رہا ہے۔ چنانچہ سب کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ اس تمام گروہ میں میر تقی میر ہی ایک ایسے بزرگ ہیں۔ جنہوں نے بعض شعراء کے متعلق تلخ لب و لہجہ اختیار کیا ہے اور اپنے زمانے کے چند شاعروں کے کلام اور سیرت پر سخت حملے کئے ہیں۔ چنانچہ میر صاحب اس وجہ سے معاصرین کی طرف سے نشانۂ ملامت بھی بنے اور ان کے خلاف وہ طوفان اٹھا جس کا مدو جزر گزشتہ اوراق میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ میر صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا وہ زمانے کی اسپرٹ کے خلاف تھا، ورنہ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بہ قول مولانا عبدالحق۔

"میر صاحب نے حق گوئی سے کام لیا مگر لوگ اس حق گوئی کے عادی نہ تھے ـــ کاش میر صاحب کا لب و لہجہ ذرا نرم اور ہمدردانہ ہوتا۔[۱]"

بہر حال مشرق اس سعادت مندی پر نازاں ہے کہ وہ گستاخانہ حقیقت نگاری سے بچا ہوا ہے اور اس کے فرزندوں کا قلم اپنے ناموروں کی تصویریں اس عمدگی سے کھینچتا ہے کہ اصلی خد و خال کی بدنمائیاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔

انصاف اور صداقت

اس مسئلے کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے دوستوں کا تو کیا ذکر، دشمنوں اور مخالفوں کے متعلق بھی انصاف اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جتھے کی عصبیت، رقابتیں اور کشمکشیں سب کی سب اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن اس سے ان کی منصفانہ رائے متاثر نہیں ہوئی۔ قائم میر سے ان کی تلخ کلامی کی وجہ سے بہت خفا ہیں لیکن میر کے بعض عیوب بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں[۲]۔

"بہر حال از ینہا در گزشتہ می گویم و حق نمی پوشم"

۱۔ آب حیات آزاد۔ ص ۱۰۵۔

۲۔ قاسم مجموعہ نغز ج ۲۔ ص ۲۲۹۔

میرزا دریائیست بیکراں و میر نہرے است
عظیم الشان۔

مصحفی اور انشا ر کے معرکے آب حیات کے ذریعہ اتنی شہرت پا چکے ہیں کہ اب محتاج تعارف نہیں رہے۔ مگر یہی مصحفی ہیں کہ اپنے تذکرہ ہندی اور ریاض الفصحا میں انشا کی خوبیوں کو بالکل نہیں چھپاتے۔

قاسم بھی سید انشا سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے لیکن بہ قول پروفیسر شیرانی۔

"ان کے قلم نے اپنی حق شناسی سے مطلق تنزلزل نہیں کیا بلکہ انشا کی سیرت کے کمزور پہلوؤں کو بھی نمایاں نہیں کیا[1]"

ان حالات میں بعض حضرات کا یہ کہنا کہ یہ تذکرہ نگار دوسروں کے اوصاف کے بیان کرنے میں بخل کا اظہار کرتے تھے اور بہ بنائے حسد ان کی خوبیوں کو چھپاتے تھے۔ مبالغہ ہے۔ بلاشبہ اس دور کی ادبی گروہ بندیاں بہت سخت اور قوی تھیں۔ اور ان میں بعض تذکرہ نویس جادہ اعتدال سے ہٹ بھی جاتے تھے (جو ایک قدرتی بات ہے) مگر یہ لوگ علی العموم اپنے تذکروں میں واقعہ نگاری اور

---

[1] قاسم دیباچہ مجموعہ نغز ۱، ھب۔

انصاف پسندی سے تجاوز نہ کرتے تھے۔

تنقید بعض جدید نقادوں کا یہ خیال ہے کہ اردو کے تذکروں میں تنقید ہے ہی نہیں لیکن وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ اس زمانے کے معاییر تنقید جدا تھے! تذکرہ میر کے ذکر میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ اس زمانے میں ادبی تنقید کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ادب کو متروکات اور غیر فصیح الفاظ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے اور اردو شاعری کو فارسی شاعری کے رتبے پر پہنچایا جائے۔

مجالس شعر و سخن حسن ذوق کی تربیت گاہیں تھیں ان میں ردّ و قدح ہوا کرتی تھی۔ تذکروں میں بھی زمانے کے ادبی مذاق کے مطابق ذوق سخن کی تربیت ہوتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ آج جب ہم ان قدیم شعراء کے متعلق مفصل اور مبسوط تنقیدوں کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں کچھ مایوسی ہوتی ہے اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ تذکروں کا ایجاز و اختصار تھا جس کی وجہ سے کہی بات بھی ان کہی رہ جاتی تھی۔

یہی سبب ہے کہ تذکروں میں ہمیں نقد شعر کے متعلق مفصل جزئیات نہیں ملتیں جن کے ذریعے ہم شعراء کے کلام کی مجموعی خوبیوں سے آشنا ہو سکیں۔ نہ ہمیں وہ اسباب معلوم ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر تذکرہ نگاروں نے اپنی آرا قائم کیں۔ میر صاحب نہایت بے لاگ نقاد تھے مگر انہوں نے بھی ریختہ کی تعریف اور اقسام۔ دکن میں

ریختہ اصلاح اشعار اور تنقید زبان تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے بے لاگ لکھا ہے قائم نے ادوار کی تعیین سے ناقدین کے لئے قدرے سہولت پیدا کردی ہے لیکن ان کی تنقیدیں بھی مختصر ہیں۔

افسوس ہے کہ جامع اور مفصل تذکروں میں تنقید کی اور بھی کمی ہے۔ مجموعہ نغز میں بہ قول پروفیسر شیرانی کہیں کہیں تنقیدی نقطہ نظر کا آزادی سے استعمال کیا گیا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی اظہار رائے میں بڑا اختصار مدنظر رکھا گیا ہے اس اختصار سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ قدیم تذکروں میں تنقید مطلقاً موجود نہیں حالاں کہ آج بھی ہم پرانے اصول تنقید کے متعلق جو معلومات رکھتے ہیں وہ انہی تذکروں کے بعض اشارات پر مبنی ہیں۔

بہر صورت وہ امور جو ان تذکروں سے دستیاب ہوتے ہیں یہ ہیں مثلاً شاعر کس صنف میں اچھا کہتا ہے؟ اس کے کلام میں درد مندی کہاں تک ہے؟ زبان کی صفائی کا کہاں تک خیال رکھتا ہے؟ صاحب دیوان تھا یا نہیں؟ اس کے شاگرد کون کون سے تھے؟ لوگ اس کی شاعری کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے؟ کون کون لوگ اس کے مد مقابل تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بعض تذکروں میں (مثلاً گلزار ابراہیم میں) شاعری کے مختلف شعبوں کا ارتقا بھی دکھایا گیا ہے۔ پھر جب تذکرہ نویسی (تاریخ

ادب کی منزل میں داخل ہو گئی تو تنقید مفصل تر ہونے لگی۔ لیکن اس منزل میں پہنچنے کے بعد تذکرہ نگاری قاموس نگاری کے اسلوب سے ہٹ کر تاریخ نگاری کے ڈھب پر آ گئی۔

انتخاب کلام ہمارے تذکروں کا وصف خاص ہے جس کا اعتراف دتاسی نے بھی کیا ہے۔ انتخاب شروع میں کم ہوتے تھے لیکن بعد میں مفصل ہوتے گئے۔ میر۔ قائم۔ اور میر حسن نے اس معاملے میں اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن عوام اشعار کی کمی کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس بے اطمینانی کی وجہ سے مجموعوں، سفینوں اور بیاضوں کو بڑی ترقی ہوئی جن میں حالات کم (یا ندارد) مگر انتخاب کلام بہت ہوتا تھا لیکن بیاضوں کو تذکرہ کا درجہ حاصل نہیں اور ان کی ادبی اور تنقیدی اہمیت بھی کچھ زیادہ نہیں۔

تنقید کے ساتھ تحقیق کا معاملہ بھی سامنے آتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بالعموم تحقیق و تفحص میں ان تذکرہ نگاروں نے کمی نہیں کی۔ صفحات کے حوالے کا رواج اس زمانے میں نہ تھا۔ لیکن اکثر صورتوں میں مصنف اپنے ماخذ کا ذکر کرتے ہیں۔ جو تذکرے معاصرین کے ہیں ان میں بھی کافی تلاش و جستجو کے آثار نظر آتے ہیں مگر بالالتزام ماخذ کا ذکر نہیں ملتا۔

مجموعہ نغز۔ چمنستان اور چند اور تذکروں میں پورے پورے

اقتباسات دوسرے تذکروں کے حوالے سے ملتے ہیں۔ قدیم تذکروں میں گردیزی نے میر صاحب سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے لیکن اعتراف نہیں کیا۔

اسی طرح بعض اور تذکرہ نگاروں نے نقل در نقل کا ارتکاب کیا ہے مگر اقرار کی زحمت گوارا نہیں کی لیکن اعلیٰ درجے کے تذکرے عموماً اس الزام سے بری ہیں۔

لہٰذا دتاسی کا یہ کہنا کہ سب تذکرے نقال در نقل ہوتے ہیں درست نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں اس قدر صحیح ہے کہ ضمنی یا جوابی تذکرے بعض اوقات نقل در نقل ہی ہوتے تھے۔ چنانچہ مرکزی کتابوں کے الفاظ و تراکیب تک کو استعمال کر لیا جاتا تھا۔ مگر ان کی یہ چوریاں چھپ نہ سکتی تھیں۔ ان پر ان کے ماخذ کا پرتو خاص طور پر نظر آجاتا ہے۔

بعض تذکرے بادی النظر میں یکساں نظر آتے ہیں اور ان میں مضمون کا اتحاد دکھائی دیتا ہے مگر نظر غائر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بڑا تذکرہ اپنی کوئی نہ کوئی مستقل خصوصیت رکھتا ہے جو دوسرے تذکروں میں نہیں پائی جاتی۔ کوئی سیرت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ کوئی اصلاح سخن کے لحاظ سے اہم ہے کوئی عمدہ انتخاب پیش کرتا ہے کوئی ایک خاص دور اور گروہ کا تذکرہ ہے ان میں سے کوئی جامع ترین ہونے کا مدعی ہے اور کوئی مختصر

لکھنے کا اقرار ہی۔

غرض ہر ایک میں جدا جدا امتیازات موجود ہیں جو ان میں سے ہر ایک کے الگ وجود و بقا کے لئے وجہ جواز ہیں۔

مثلاً میر کا تذکرہ بے لاگ تنقید سیرت کے لئے گلزار ابراہیم اور گلشن ہند شعرائے پورب اور تاریخوں کے لئے۔ چمنستان شفیق دکن کے شعراء کے لئے۔ مجموعہ نغز اور عیار الشعراء جامعیت کے لئے۔ تذکرہ میر حسن حسن انتخاب کے لئے۔ گلشن بے خار۔ شیفتہ اعتدال اور حسن تنقید کے لئے قائم ادوار کی حد بندی کے لئے غرض سب مرکزی تذکرے اپنی اپنی جگہ اہمیت اور امتیاز رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی مستقل ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔

البتہ یہ اعتراض صحیح ہے کہ ان میں اعادہ و تکرار بہت ہے اور معلومات کے متلاشی کو ضروری باتوں کے جمع کرنے میں بڑی تکلیف پیش آتی ہے۔ اسی لئے تلخیص کی ہمیشہ ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ چنانچہ سپرنگر نے اپنی فہرست میں اس قسم کی ایک کوشش کی بھی ہے مگر یہ کئی لحاظ سے ناقص ہے۔ اگر اردو شعراء کی ایک عمدہ بیاگرافیکل سائیکلو پیڈیا۔ تیار کر لی جائے جس میں ان سب تذکروں کا لب لباب موجود ہو تو یقیناً یہ ایک بڑی خدمت ہو گی جس سے ہمیں اپنے سب شاعروں کے مجمل مگر صحیح حالات یک جا معلوم ہو سکیں گے۔ خم خانہ جاوید اس تخیل کی عملی تصویر معلوم

ہوتی ہے مگر یہ ابھی مکمل نہیں۔

تتمہ یہ تذکروں کا تذکرہ صرف ضروری اشارات پر مشتمل ہے اس میں میں نے حتی الوسع تنقید کے قدیم اور جدید معیار میں توازن قائم رکھا ہے۔ میں ان اصحاب سے متفق نہیں ہوں جو محض اس لئے کہ قدیم تذکروں کے معیار اور اقدار ان کے ذاتی معیار اور اقدار سے مختلف ہیں، قدیم تذکروں کو سراپا عیب سمجھتے ہیں۔ ہمیں ہر قدیم ادبی کارنامے کے متعلق رائے قائم کرتے وقت پرانے زمانے کے معاییر اور اقدار کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ مولانا عبدالحق صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ۔

> ہمارے شعراء کے تذکرے گو جدید اصول کے مطابق نہ لکھے گئے ہوں تاہم ضمنی طور پر ان میں بہت سی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو ایک محقق اور ادیب کی نظروں میں جواہر ریزوں سے کم نہیں ان سے شاعروں کے ضروری حالات اور ان کا ماحول ہمارے مشاہدے میں آجاتا ہے۔"

ان سے ان ایام کی معاشرت اور زندگی کے نقشے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ ان سے ان لوگوں کا معیار اخلاق و معاشرت ہمیں معلوم ہو جاتا ہے ان تذکروں ہی میں ادبی و علمی حلقوں کے مشاغل اور تفریحوں کا حال ان کی علمی مجلسوں، مشاعروں اور

مرا ختوں کی سرگزشت مل جاتی ہے ان کے اخلاق اور کمزوریاں
ان کی رقابتیں اور کشمکشیں، وضع داریاں اور پاس داریاں
ان کے توہمات و تکلفات اور دید و دادید کے طریقے باہمی سلوک
و مراعات ان کے رد و قبول اور پسند و ناپسند کے معیار غرض سارے
نظام معاشرت کی روشن تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بلاشبہ
یہ تذکرے ہماری ادبی تاریخ کا قیمتی سرمایہ اور ہماری قدیم معاشرت
اور تہذیب کی بڑی قابل قدر یادگاریں ہیں ان کو کسی طرح نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا۔